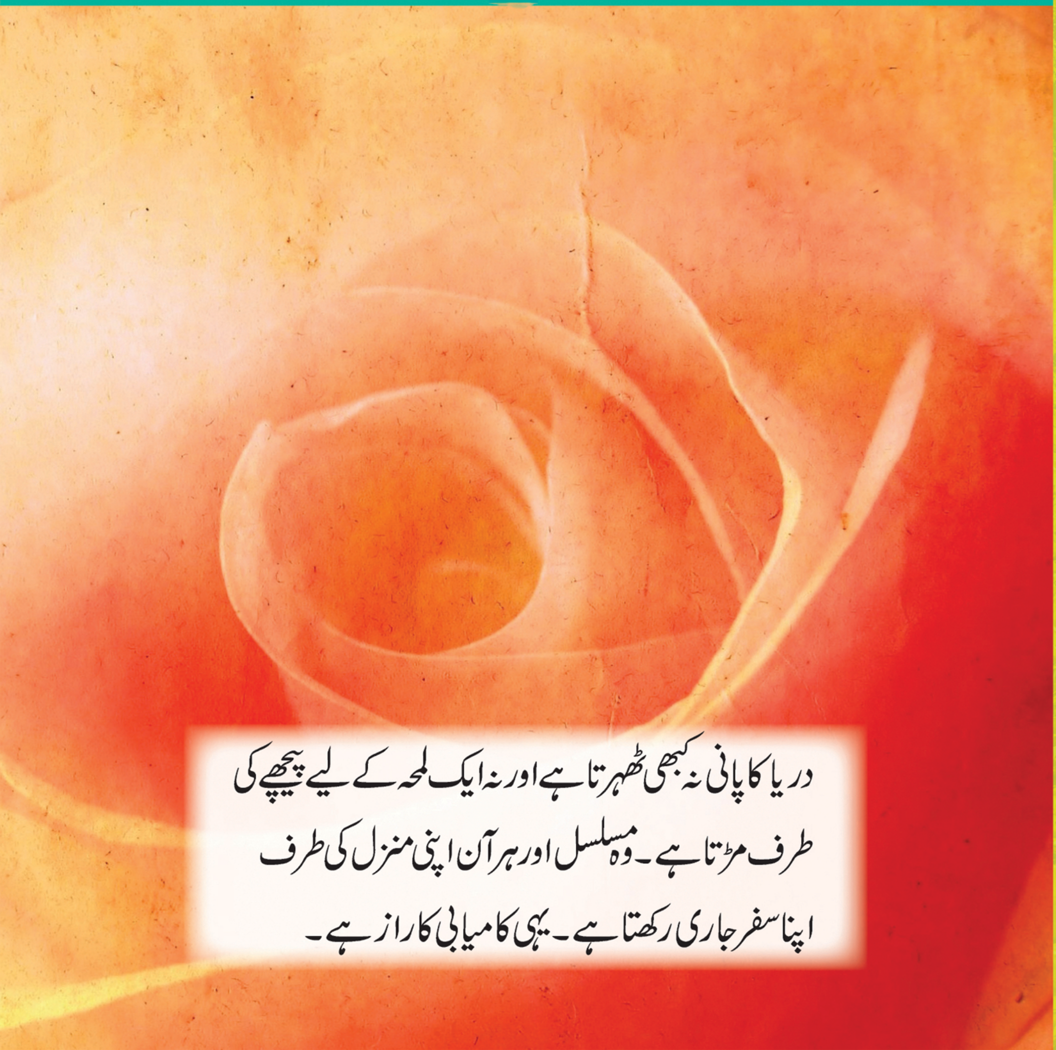
www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

April 2008 • No. 377



دریا کا پانی نہ کبھی ٹھہرتا ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے پیچھے کی طرف مڑتا ہے۔ وہ مسلسل اور ہر آن اپنی منزل کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الرسالہ

Al-Risala

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
website: www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10,
One year Rs. 100,
Two years Rs. 200,
Three years Rs. 250,
Abroad: One year $10 (Air Mail)

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

اپریل 2008

فہرست

صلاۃ کلچر

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بین العبد والکُفر ترک الصلوۃ (صحیح مسلم، کتاب الایمان)۔ یعنی نماز کسی آدمی کے اسلام کی پہچان ہے، اور کسی آدمی کا اسلام سے نکل جانا یہ ہے کہ وہ نماز کی عبادت ترک کردے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ دین میں نماز کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ پنج وقتہ نماز دراصل اعترافِ خداوندی کی عملی صورت ہے۔ نماز کے تمام اَجزا بندے کی طرف سے اپنے رب کے اعتراف کو ممثّل (symbolize) کرتے ہیں۔ اِس اعتبار سے نماز عبادتِ الٰہی کی کامل صورت ہے۔ نماز میں وہ تمام اجزا مکمل طور پر پائے جاتے ہیں جو عبادت کی نسبت سے انسان سے مطلوب ہیں۔ نماز کو رات اور دن کے درمیان پانچ مخصوص اوقات کے ساتھ مقرر کیا گیا ہے۔ یہ بے حد اہم ہے۔ اِس طرح نماز کو کسی انسان کے لیے اس کے لازمی رُٹین (compulsive routine) میں شامل کردیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو حالات کے زیر اثر، انسان بار بار عذر (excuse) لیتا رہے اور وہ نماز جیسی عبادت کی پابندی نہ کرسکے۔

نماز کی عبادت کے لیے باجماعت نماز کا نظام مقرر کرنا گویا کہ اُس کو ایک مکمل کلچر کا درجہ دے دینا ہے۔ اِس طرح باجماعت نماز اپنے متنوع پہلوؤں کے ساتھ انسان کی پوری زندگی میں شامل ہوجاتی ہے۔ باجماعت نماز کی پابندی کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خدا کی عبادت کو انسان کی زندگی میں مرکزی مقام حاصل ہوجاتا ہے۔ انسان کی پوری زندگی کے لیے نماز ایک قسم کے رِگولیٹر (regulator) کی حیثیت حاصل کرلیتی ہے۔ نماز کسی انسان کی زندگی کو خدا رُخی زندگی بنادیتی ہے۔

نماز ابتدائی طور پر ایک انفرادی عبادت ہے، لیکن جب کچھ لوگ مسجد پہنچ کر وہاں امام کی اقتدا میں باجماعت نماز ادا کرتے ہیں تو نماز اُن کی زندگی کے لیے گویا اجتماعی شیرازہ بن جاتی ہے— اِن متنوع فوائد کا تقاضا ہے کہ ہر آدمی نماز کو اپنی زندگی میں لازمی طور پر شامل کرلے۔ اگر بالفرض آدمی کو خشوع کی نماز حاصل نہ ہو، تب بھی اس کے لیے نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔ کیوں کہ نماز یاددہانی کے لیے ہے (طٰہٰ: 14) اور یاددہانی کا فائدہ پھر بھی آدمی کو حاصل ہوجاتا ہے۔

سفارش نہیں، استحقاق

بعد کے زمانے میں مسلمانوں میں بہت سی ایسی موضوع روایتیں رائج ہوئیں جو یہ بتاتی تھیں کہ جنت میں داخلے کا معاملہ سفارش (recommendation) پر مبنی ہے، نہ کہ استحقاق (merit) پر۔ مثلاً یہ کہ جس گھر میں ایک حافظ ہو، اس کی سفارش پر اس کے خاندان کے بہت سے لوگ جنت میں داخل کردیے جائیں گے۔ اِسی طرح پیغمبر کے بارے میں بہت سی موضوع روایتیں رائج ہوئیں۔ مثلاً: **الصّالح لله والطّالح لي** (نیک خدا کے لیے ہے، اور بد میرے لیے)۔ مگر یہ تمام روایتیں قطعی طور پر بے بنیاد ہیں، اسلام میں ان کی کوئی اصل نہیں:

It has no basis in fact.

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا مستحقینِ جنت کے انتخاب (selection) کی دنیا ہے۔ جنت میں صرف اُنھیں لوگوں کو داخلہ ملے گا جنھوں نے موجودہ دنیا میں اپنے عمل سے اس کا استحقاق ثابت کیا ہو۔ قرآن کی سورہ نمبر 53 میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے اُس نے دنیا کی زندگی میں کوشش کی (النّجم: 29)۔ اِسی طرح قرآن کی سورہ نمبر 2 میں بتایا گیا ہے کہ آخرت کے دن کسی آدمی کے لیے نہ خرید وفروخت کام آئے گی اور نہ دوستی اور نہ سفارش (البقرۃ: 254)۔

سفارش جیسی چیزوں کو جنت میں داخلے کا ذریعہ سمجھنا، جنت کی تصغیر (underestimation) ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں تمام انسانوں کی زندگی کا اعمال نامہ (record) تیار کیا جارہا ہے۔ جنت ایک اعلیٰ ترین مقام ہے، اور موجودہ دنیا کے ریکارڈ کی بنیاد پر اعلیٰ ترین انسانوں کو وہاں آباد کرنے کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ قرآن کے مطابق، جنت وہ جگہ ہے جو خدائے برتر کے پڑوس میں بنے گی، اور جہاں سچے لوگ سچائی کی دنیا میں ابدی جگہ پائیں گے (القمر: 55)۔ جنت خدا کے پڑوس (التحریم: 11) میں رہنے کا نام ہے۔ یہ تصور مضحکہ خیز حد تک بے اصل ہے کہ خدائے برتر کے پڑوس میں داخلہ کسی کو محض انسانی سفارش کی بنیاد پر حاصل ہوجائے۔

دوطرفہ معاملہ

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لایرمی رجلٌ رجلاً بالفسق ولا یرمیه بالکفر إلاّ ارتدّت علیه، إن لم یکن صاحبه کذلک** (مسند احمد، جلد 5، صفحہ 181) یعنی جب بھی ایک آدمی دوسرے آدمی پر کافر یا فاسق ہونے کا الزام لگاتا ہے، تو ضرور یہ الزام خود قائل کی طرف لوٹ آتا ہے، اگر دوسرا آدمی ویسا نہ ہو۔

یہ کوئی پُراسرار بات نہیں۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے جس کو خدا نے اِس دنیا میں قائم کر رکھا ہے۔ اِس قانون کو موجودہ زمانے میں بوم رینگ (boomerang) کا قانون کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی چیز کو آپ جس قوت سے دوسرے کی طرف پھینکیں، اُسی قوت سے وہ آپ کی طرف لوٹ کر آئے گی:

It is the law of the boomerang— the harder and faster you throw it, the faster and more violently it comes back.

جب کوئی آدمی کسی کو برا کہتا ہے، یا اس کو فاسق یا کافر بتاتا ہے تو وہ اپنے داخلی احساس کے تحت اس کو محض ایک یک طرفہ معاملہ سمجھتا ہے، یعنی ایک ایسی بات جس کا تعلق خود اس کی اپنی ذات سے نہیں ہے، بلکہ صرف دوسرے شخص کی ذات سے ہے۔ مگر یہ ایک خطرناک بھول ہے۔ کیوں کہ اگر دوسرا آدمی ویسا نہیں ہے جیسا آپ نے اس کو بتایا ہے، تو آپ کا کہا ہوا خود آپ کی طرف لوٹ آئے گا۔ جو الزام آپ دوسرے شخص کو دے رہے تھے، آپ خود اس کے مجرم بن جائیں گے۔

اب اگر یہ دیکھا جائے کہ فسق یا کفر کا تعلق انسان کے دل سے ہے، اور دل کا حال صرف خدا جانتا ہے تو ہر وہ شخص جو خدا سے ڈرتا ہو، اس کا حال یہ ہو جائے گا کہ اِس قسم کی زبان استعمال کرنے سے وہ آخری حد تک بچے گا۔ وہ اگر کسی شخص کے اندر کوئی برائی دیکھ رہا ہے تو وہ خیر خواہانہ انداز میں اس کو نصیحت کرے گا۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا کہ وہ اس کے بارے میں فاسق اور کافر جیسی زبان بولنے لگے۔ وہ کسی شخص کے فسق اور کفر کو خدا کے اوپر چھوڑ دے گا، اور اپنی ذمّے داری صرف یہ سمجھے گا کہ وہ نصیحت اور تلقین کے ذریعے دوسرے انسان کی اصلاح کی کوشش کرتا رہے۔

اولاد پرستی کا فتنہ

ایک حدیثِ رسول میں بتایا گیا ہے کہ سب سے زیادہ گھاٹے میں وہ شخص ہے جو دوسرے کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت کو کھودے (أذهب آخرته بدنيا غيره، ابن ماجه، كتاب الفتن)۔ یہ حدیث موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ اُن لوگوں پر چسپاں (apply) ہوتی ہے جو صاحبِ اولاد ہیں۔ موجودہ زمانے میں صاحبِ اولاد لوگوں کا حال یہ ہے کہ ہر ایک کے لیے اس کی اولاد اُس کا سب سے بڑا کنسرن (supreme concern) بنی ہوئی ہے۔ ہر ایک کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے زیادہ سے زیادہ دنیا کمانے میں مصروف ہے، اور خود اپنی آخرت کی خاطر کوئی حقیقی کام کرنے کے لیے آدمی کے پاس وقت ہی نہیں۔

موجودہ زمانے میں ہر آدمی اِس حقیقت کو بھول گیا ہے کہ اس کی اولاد اُس کے لیے صرف امتحان کا پرچہ (الأنفال: 28) ہے۔ اولاد اس کو اِس لیے نہیں ملی ہے کہ وہ بس اپنی اولاد کو خوش کرتا رہے، وہ اپنی اولاد کی دنیوی کامیابی کے لیے اپنی ساری توانائی لگادے۔

موجودہ زمانے میں بہت سے لوگ ہیں جو بظاہر مذہبی وضع قطع بنائے رہتے ہیں اور رسمی معنوں میں صوم وصلاۃ کی پابندی بھی کرتے ہیں، لیکن عملاً وہ اپنا سارا وقت اور اپنی بہترین صلاحیت صرف دنیا کمانے میں لگائے رہتے ہیں، صرف اِس لیے کہ جب وہ مریں تو اپنی اولاد کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ سامانِ دنیا چھوڑ کر جائیں۔

مگر ایسے لوگ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ خدا کو دینے کے لیے اُن کے پاس صرف کچھ ظاہری رسوم ہیں اور جہاں تک حقیقی زندگی کا تعلق ہے، اس کو انھوں نے صرف اپنی اولاد کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ یہ خدا پرستی نہیں ہے، بلکہ وہ حدیث کے الفاظ میں اولاد پرستی ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اولاد پرستی کا طریقہ کسی کو خدا پرستی کا کریڈٹ نہیں دے سکتا۔ خدا پرستی، زندگی کا ضمیمہ (appendix) نہیں، حقیقی خدا پرستی وہ ہے جو انسان کی پوری زندگی کا اِحاطہ کیے ہوئے ہو۔

دعوت اور انگریزی

موجودہ زمانے میں انگریزی زبان ایک انٹرنیشنل زبان (international language) کی حیثیت رکھتی ہے۔ کمپیوٹر انقلاب (computer explosion) کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دنیا کی آبادی کے تقریباً 75 فی صد لوگوں کے لیے انگریزی زبان رابطے کی زبان (link language) بن گئی ہے۔ انگریزی زبان کے اِس پھیلاؤ کی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ دعوت الی اللہ کے کام کے لیے انگریزی زبان کو جاننا داعی کی ایک لازمی ضرورت بن گیا ہے۔

لیکن موجودہ زمانے میں جس طرح انگریزی زبان کو عمومی پھیلاؤ حاصل ہوا ہے، اِسی طرح ایک اور چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں بہت زیادہ پھیلاؤ حاصل ہوا ہے، یہ دوسری چیز سائنٹفک تھنکنگ ہے۔ موجودہ زمانے میں موثر دعوتی عمل کے لیے صرف انگریزی زبان جاننا کافی نہیں۔ اِسی کے ساتھ لازمی طور پر ضروری ہے کہ آدمی یہ جانے کہ جدید فکر (modern thought) کیا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جس کو سائنسی استدلال (scientific reasoning) کہا جاتا ہے۔

جب آپ کسی شخص کے اوپر دعوتی عمل کریں تو اُس وقت دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک، یہ کہ بہ اعتبارِ زبان آپ کی بات مدعو کے لیے قابلِ فہم ہو۔ دوسرے، یہ کہ آپ کا استدلال مدعو کے اپنے مسلّمہ (axiom) پر مبنی ہو، تاکہ وہ مدعو کے ذہن کو ایڈریس کرسکے۔

داعی اگر صرف انگریزی زبان جانتا ہو، لیکن وہ جدید اصولِ استدلال سے ناواقف ہو تو اس کی بات مدعو کی سمجھ میں تو آئے گی، لیکن وہ اس کے دل میں نہیں اترے گی۔ وہ اس کے ذہن کو مطمئن نہیں کرے گی۔ وہ اس کے اندر وہ فکری بھونچال نہیں پیدا کرے گی جس کے بعد آدمی اپنی سوچ پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ جس دعوتی عمل میں پہلی چیز موجود ہو، لیکن دوسری چیز موجود نہ ہو، وہ حقیقی معنوں میں دعوتی عمل نہیں۔ کیوں کہ حقیقی دعوت کی تعریف قرآن میں یہ کی گئی ہے کہ وہ قولِ بلیغ (النّساء: 63) کے اسلوب میں ہو، یعنی ایسا اسلوبِ دعوت جو مدعو کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے والا ہو۔

جدالِ احسن کیا ہے

جِدال (discussion) کے دو طریقے ہیں۔ ایک، احسن اور دوسرا، غیر احسن۔ جدالِ احسن یہ ہے کہ زیر بحث مسئلے پر مسلّمہ دلیل کی روشنی میں اظہارِ خیال کیا جائے۔ مثلاً حضرت ابراہیم کا معاصر بادشاہ خدائی کا دعوے دار تھا۔ آپ نے اس کے دعوے کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لیے کہا کہ خدا، سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم اس کو مغرب سے نکال دو (البقرۃ: 258)۔ سورج کا مشرق سے نکلنا اور مغرب میں ڈوبنا مسلمہ طور پر ایک برتر طاقت کا عمل تھا، اِس لیے مذکورہ بادشاہ اس کے مقابلے میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔

جدالِ غیر احسن یہ ہے کہ آپ فریقِ ثانی کے خلاف کوئی مسلّمہ دلیل نہ دیں، اِس کے برعکس، آپ یہ کریں کہ اُس کے خلاف صرف منفی ریمارک (negative remark) دیں، لفظی طور پر اس کی مذمت کریں اور بیانیہ انداز میں اس کو غلط بتائیں۔ یہ جدالِ غیر احسن ہے، اِس سے کبھی مطلوب نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اِسی قسم کے جدالِ غیر احسن سے مسلمانوں کو روکنے کے لیے قرآن میں یہ حکم دیا گیا کہ: اور اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں، اُن کو تم بُرا نہ کہو، ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو بُرا کہنے لگیں گے (الأنعام: 109)۔

قرآن، توحید کی کتاب ہے۔ سارا قرآن براہِ رست یا بالواسطہ طور پر، توحید کا بیان ہے، مگر یہ تمام بیانات دلائل کی زبان میں ہیں۔ کیوں کہ دلیل کی زبان ہی میں کوئی قول، قولِ بلیغ (النساء: 63) بنتا ہے۔ مگر قرآن میں اس کو پسند نہیں کیا گیا کہ کوئی شخص توحید کے مسئلے کو سب وشتم کی زبان میں بیان کرے۔ کیوں کہ ایسے اسلوب سے مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ ایسے اسلوب کا نتیجہ ہمیشہ منفی ہوتا ہے، ایسے اسلوب کے ذریعے کبھی مثبت نتیجہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

جدالِ غیر احسن کے اِس معاملے کی ایک مثال حدیثِ رسول میں یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مدینہ کے ایک یہودی اور مسلمان کے درمیان نبوت کے مسئلے پر تکرار ہوئی۔ یہودی نے کہا: إن الله اصطفیٰ موسیٰ علی العالمین (اللہ نے موسیٰ کو تمام دنیا والوں پر افضل

بنایا)۔ اِس کو سن کر مسلمان نے یہودی کو تھپڑ مارا اور کہا کہ تم غلط کہتے ہو، اللہ نے محمد کو تمام دنیا والوں پر افضل بنایا ہے (إنّ الله اصطفیٰ محمداً علی العالمین)۔

اِس کے بعد مذکورہ یہودی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور اس نے آپ سے اِس معاملے کی شکایت کی۔ اِس کو سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہوگئے، یہاں تک کہ غضب آپ کے چہرے پر ظاہر ہوگیا۔ آپ نے کہا کہ اللہ کے نبیوں کو ایک دوسرے پر افضل نہ بتاؤ (لا تفضلوا بین أنبیاء الله)، کیوں کہ قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا، تو زمین اور آسمان کے تمام لوگ بے ہوش ہوجائیں گے، سوا اس کے جس کو خدا چاہے۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا، پھر میں پہلا شخص ہوں گا جو ہوش میں آکر کھڑا ہوگا۔ پھر میں دیکھوں گا کہ موسیٰ عرشِ الٰہی کو پکڑ کر کھڑے ہوئے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ بے ہوش ہوئے تھے اور پھر ہوش میں آگئے، یا اللہ نے اُن کو بے ہوشی سے مستثنیٰ رکھا (صحیح البخاری ومسلم، بہ حوالہ: جامع الأصول فی أحادیث الرسول، رقم الحدیث:6308)۔

اِس روایت میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو کچھ نہیں کہا، آپ نے یہودی کو ''گستاخِ رسول'' قرار نہیں دیا۔ آپ اُس وقت مدینہ میں حاکم کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے اِس معاملے میں یہودی کی طرف سے بالکل صرفِ نظر فرمایا۔ آپ نے صرف مسلمان کو نصیحت کی۔ آپ نے مسلمان کو ہمیشہ کے لیے اِس قسم کے رویّے سے باز رہنے کا حکم دیا۔

دوسری بات جو اِس واقعے سے معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ اسلام میں تفضیل اور تفاخر کی زبان استعمال کرنا مطلقاً ممنوع ہے۔ اہلِ ایمان کو جس طرح سب وشتم کی زبان سے مکمل طور پر بچنا ہے، اُسی طرح اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ تفضیل اور تفاخر کی زبان سے مکمل طور پر اپنے آپ کو دور رکھیں۔

سب وشتم کی زبان اگر نفرت کا ماحول پیدا کرتی ہے تو تفضیل اور تفاخر کی زبان استعمال کرنے سے بے جا فخر کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ اور دونوں ہی کا مشترک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان معتدل تعلقات ختم ہوجاتے ہیں، اور جہاں لوگوں کے درمیان معتدل تعلقات نہ ہوں، وہاں دعوت کا عمل بھی موثر طور پر جاری نہیں رکھا جاسکتا۔

مدینہ کا مذکورہ واقعہ گویا کہ اسلام کی تاریخ میں پہلا مناظرہ (debate) تھا۔ اس واقعے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مناظرے کا طریقہ اسلامی طریقہ نہیں، مناظرہ جاہلیت کا طریقہ ہے۔ مناظرہ گویا کہ اسٹیج پر کیا ہوا لفظی دَنگل ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ لفظی دنگل کا کوئی فائدہ کسی کو نہ دنیا میں ملنے والا ہے اور نہ آخرت میں۔ اِس قسم کا طریقہ کسی شخص کو عوامی مقبولیت دے سکتا ہے، لیکن اسلام کو یا اسلامی دعوت کو اس سے کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں۔

جدال (discussion) کا مقصد اسلامی تعلیم کے مطابق یہ ہے کہ فریقِ ثانی کو مطمئن (convince) کیا جائے۔ اسلام کے مطابق، جدال کا مقصد یہ نہیں ہے کہ فریقِ ثانی کو شکست دے دی جائے اور پھر تالیاں بجا کر بطور خود یہ فرضی خوشی حاصل کی جائے کہ ہم نے دوسرے کو ہرا کر اس کے اوپر جیت حاصل کر لی۔

اسلامی جدال یا دعوتی کلام کا اصل محرک فریقِ ثانی کے لیے خیر خواہی (well-wishing) ہے، یعنی فریقِ ثانی کو مطمئن کر کے اُس کو اِس قابل بنانا کہ وہ خدا کی رحمت کے سایے میں آجائے۔ دعوتی کلام فریقِ ثانی کے لیے دردمندی کے جذبے کے تحت نکلتا ہے، اور مناظرانہ کلام فریقِ ثانی کو کسی نہ کسی طرح ہرانے کے جذبے سے۔

قومی فخر نہیں

دورِ اوّل میں جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے، اُن کے لیے اسلام ایک ذاتی دریافت (discovery) تھا۔ وہ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت میں جینے والے لوگ تھے۔ تقریباً سو سال کے بعد مسلمانوں کی یہ پہلی نسل ختم ہوگئی۔ اِس کے بعد نسلی مسلمانوں کا دَور آیا۔ اِس دور کے لوگوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، اُس میں اہلِ اسلام کو سیاسی دبدبہ حاصل ہو چکا تھا۔ پہلے دور میں اگر اسلام دریافتِ خداوندی کے ہم معنیٰ تھا تو دوسرے دور میں اسلام ایک پولٹکل ایمپائر کے ہم معنیٰ بن چکا تھا۔

یہ دوسرا دور قریب ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ اِس ہزار سال کے اندر مسلم فکر کا جو ارتقا ہوا، وہ خلافت کے نام پر سیاسی عظمت (political glory) پر مبنی تھا۔ اب مسلمانوں کے تمام ادارے، مسلم نسلوں کو فخر اور عظمت کا سبق دینے لگے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو برتر سمجھنے لگے۔ بعد کی مسلم نسلوں میں، شعوری یا غیر شعوری طور پر، یہ ذہن بن گیا کہ ہم ہر اعتبار سے دوسری قوموں سے افضل ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

مگر اٹھارھویں صدی عیسوی میں ایک نیا انقلاب آیا۔ قانونِ فطرت کے تحت، اب مسلم ایمپائر ٹوٹنے لگا۔ مسلمان زندگی کے ہر میدان میں دوسروں سے پیچھے جانے لگے۔ اب مغربی قوموں نے سیاسی اور تہذیبی برتری کا درجہ حاصل کرلیا۔ اچانک مسلمانوں کے ساتھ یہ فکری حادثہ پیش آیا کہ جس دنیا میں وہ دوسروں کے مقابلے میں برتری کے احساس میں جی رہے تھے، وہاں وہ مجبور ہوگیے کہ دوسروں کے مقابلے میں کم تری کے احساس میں زندگی گزاریں۔

بیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں یہ صورتِ حال پوری طرح واضح ہوگئی۔ اُس وقت مسلم دنیا میں بڑی تعداد میں مصلحین (reformers) پیدا ہوئے، مگر اِس نیے مرحلے میں ہمارے رہ نماؤں سے یہ بھیانک غلطی ہوئی کہ وہ ردّ عمل کی نفسیات کے ساتھ اُبھرے۔ میرے علم کے مطابق، اِس دَور کا کوئی ایک بھی مسلم رہ نما ایسا نہیں ہے جو ردّ عمل کی نفسیات سے اوپر اُٹھ کر

معاملے کو سمجھے اور خالص مثبت انداز میں مسلمانوں کو فکری رہ نمائی دے۔

حقیقت یہ ہے کہ تبدیلیٔ اقتدار کا یہ معاملہ، فطرت کے ایک قانون کے تحت ہوا۔ اِس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **تلك الأيّام نداولها بين الناس** (آل عمران: 140)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں غلبہ واقتدار بھی، دوسری دُنیوی چیزوں کی طرح، امتحان کا ایک پرچہ (test paper) ہے۔ اقتدار کے اوپر کسی ایک قوم کی اجارہ داری (monopoly) نہیں ہوسکتی، وہ کبھی ایک قوم کے پاس رہے گا اور کبھی دوسری قوم کے پاس۔ فطرت کا یہی قانون تھا جس کا نفاذ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے اوپر ہوا۔

ایسے وقت میں مسلم رہ نماؤں کو صرف ایک کام کرنا تھا، وہ یہ کہ وہ مسلمانوں کے اندر خود احتسابی (introspection) کا مزاج پیدا کریں۔ وہ مسلمانوں کو اصلاح اور تعمیر اور استحکام کے داخلی کاموں میں لگائیں۔ وہ مسلمانوں کو جدید تعلیم میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھائیں۔ وہ مسلمانوں کو جدید سائنس اور جدید صنعت اور تجارت کے میدان میں ترقی کرنے کا سبق دیں۔ وہ مسلمانوں کو یہ بتائیں کہ سیاسی اقتدار کے باہر سیکڑوں قیمتی مواقع (opportunities) ہیں جو اُن کے لیے پوری طرح کھُلے ہوئے ہیں، اِس لیے انھیں چاہیے کہ وہ سیاسی ٹکراؤ کا راستہ چھوڑ کر پُر امن تعمیر کا طریقہ اختیار کریں۔ وہ ماضی کو بھُلا کر مستقبل کی نئی تعمیر کو اپنا نشانہ بنائیں۔

اِس دَور کے مسلم رہ نماؤں کے لیے ضروری تھا کہ وہ مسلمانوں کو تعمیری رہ نمائی دیں، یعنی پُرامن طور پر داخلی تعمیر واستحکام کا راستہ بتانا۔ مگر ہر ایک نے مسئلے کو صرف ایک خارجی مسئلہ (external problem) سمجھا۔ ہر ایک نے مسلمانوں سے کہا کہ دوسرے لوگ ظالم اور غاصب ہیں تم اُن سے لڑ کر اپنے لیے زندگی کا حق حاصل کرو، یعنی انھوں نے تعمیری رہ نمائی کے بجائے، عسکری رہ نمائی دی۔ اِس معاملے میں عرب لوگوں کو اپنے موجودہ مزاج کے تحت صرف ایک ماڈل نظر آیا، اور وہ صلاح الدین ایوبی (وفات: 1193) کا ماڈل تھا۔ عرب ذہن کی نمائندگی کرتے ہوئے عرب شاعر الزرکلی نے کہا:

هاتِ صلاح الدين، ثانيةً فينا جدّدى حطّين، أو شبه حطّينا

صلاح الدین کودوبارہ ہمارے پاس لاؤ۔اور حطین کا معرکہ یا حطین جیسا معرکہ دوبارہ گرم کرو۔

امیر شکیب ارسلان (وفات: 1946) نے اپنی مشہور کتاب: **لماذا تأخّر المسلمون وتقدّم غيرهم** (1938) میں مسلمانوں کو دوبارہ عسکری معرکہ آرائی پر ابھارا ہے اور عسکری اقدام کو کامیابی کا راز بتایا ہے۔ اِس سلسلے میں انھوں نے حسب ذیل شعر نقل کیا ہے:

تأخّرتُ أستبقي الحياةَ، فلم أجد   لنفسي حياةً، مثل أن أتقدّما

میں زندہ رہنے کے لیے (میدانِ جنگ) سے پیچھے رہا، لیکن میں نے اپنے لیے کوئی زندگی نہ پائی۔ زندگی تو صرف آگے بڑھنے والوں کے لیے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض غیر مسلم مصنفین نے دورِ جدید کے مسلم ذہن کی جو تصویر پیش کی ہے، وہ عسکریت (militancy) کی تصویر ہے۔ اِس سلسلے میں رام موہن گاندھی نے اقبال کا یہ مصرعہ نقل کیا ہے:

ہر مسلماں رگِ باطل کے لیے نشتر تھا

اِس مصرعے کا انگریزی ترجمہ انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:

For every vein of falsehood, every Muslim was a knife.

اِس دور کے تمام مسلم رہ نما ردِّ عمل کی نفسیات کا شکار ہوگیے تھے، اِس لیے وہ صرف منفی رُخ پر سوچتے رہے۔ انھوں نے انتہائی غیر دانش مندانہ طور پر یہ کیا کہ غیر مسلم قوموں کو اسلام دشمن قرار دے کر، مسلمانوں کو اُن سے متنفّر کردیا۔ مسلمان اِس قابل نہ رہے کہ وہ نئی ابھرتی ہوئی قوموں کے بارے میں مثبت رائے قائم کریں، وہ اُن سے نئی حقیقتوں کو سیکھیں۔

اِس نئی صورت حال کے پیش آنے کے بعد، اصل ضرورت یہ تھی کہ مسلمانوں کو بتایا جائے کہ غیر مسلم اقوام کا کیس اُن کے خلاف دشمنی کا کیس نہیں، بلکہ وہ اُن کے لیے چیلنج کا کیس ہے۔ فطرت کے عمومی قانون کے تحت، اِن قوموں نے مسلمانوں کو چیلنج دیا ہے، اور اب مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ وہ مثبت ذہن کے ساتھ اِس کا سامنا کریں۔ وہ پورے معاملے پر نظر ثانی (reassessment) کرکے نئی منصوبہ بندی کے تحت دنیا میں دوبارہ اپنا مقام بنائیں۔ یہی مسلمانوں کی صحیح رہ نمائی تھی، مگر منفی نفسیات

میں مبتلا رہ نما، مسلمانوں کو یہ صحت مند رہ نمائی (healthy guidance) نہ دے سکے اور پوری مسلم دنیا منفی سوچ اور غصہ اور نفرت میں مبتلا ہو کر رہ گئی۔

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں پوری مسلم دنیا میں بڑی تعداد میں مسلم رہ نما پیدا ہوئے، مگر اِن تمام مسلم رہ نماؤں کا کیس مشترک طور پر وہی تھا جو اوپر بیان ہوا۔ عرب دنیا میں اِس زمانے میں سید جمال الدین افغانی، سید قطب، امیر شکیب ارسلان، وغیرہ نے یہی کام کیا۔ اِسی طرح برّصغیر ہند میں اقبال اور ابوالاعلیٰ مودودی، وغیرہ یہی کام کرتے رہے۔ میرے علم کے مطابق، رہ نماؤں کی لمبی فہرست میں کوئی بھی اِس معاملے میں استثنا (exception) کی مثال نہیں۔ یہ منفی رہ نمائی مسلمانوں کو جہاد کے نام پر تشدد تک لے گئی، اور جب مسلمان دوسروں کو ہلاک کرنے پر قادر نہ ہوسکے تو انھوں نے خودکُش بم باری (suicide bombing) کے ذریعے خود اپنے آپ کو ہلاک کرنا شروع کردیا۔

اِس صورت حال کا ایک انوکھا ظاہرہ وہ ہے جس کو میں نظریاتی خود فریبی سے تعبیر کروں گا۔ موجودہ زمانے میں آپ کو بہت سے مسلمان ملیں گے جو یہ کہیں گے کہ ہم کو سید قطب کی تحریروں اور ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابوں اور احمد دیدات کے کیسیٹس کے ذریعے نیا ایمان حاصل ہوا ہے۔ اِن حضرات کے افکار سے ہم کو دوبارہ اسلام ملا ہے، ورنہ ہم اسلام سے دور چلے گیے تھے۔

میں نے اِن حضرات کے کیس پر بہت غور کیا۔ میرے نزدیک یہ مسلم رہ نما، منفی خوراک دیتے ہیں نہ کہ مثبت خوراک۔ پھر کیسے ایسا ہوا کہ اُن کی باتوں سے کچھ لوگوں کو مثبت اسلام مل گیا۔ اِس قسم کے بہت سے لوگوں سے میری ملاقاتیں ہوئیں۔ گہرے جائزے کے بعد آخری طور پر جو بات میری سمجھ میں آئی، وہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو جو چیز ملی ہے، وہ قومی اسلام ہے نہ کہ حقیقی اسلام۔ بیسویں صدی میں بہت سے مسلمان، خاص طور پر مسلم نوجوان، اِس احساس میں جی رہے تھے کہ دوسری قوموں نے اُن کا قومی فخر اُن سے چھین لیا ہے۔ مسلّح جہاد کے باوجود وہ اپنے اِس قومی فخر کو دوبارہ حاصل نہ کرسکے۔

اِس دوران میں یہ ہوا کہ کچھ ایسے لوگ نکلے جو الفاظ کی دنیا میں ان کے جذباتِ فخر کی تسکین فراہم کررہے تھے۔ کسی نے بتایا کہ مغرب کی سائنسی ترقی مسلم دماغوں کی خوشہ چینی کے ذریعے ہوئی

ہے۔ کسی نے مسلمانوں کی سیاسی فتوحات پر کتابیں لکھ کر اُن کو ماضی کی عظمت دوبارہ یاددلائی۔ کسی نے بتایا کہ اسلام کا نظام دنیا کے تمام نظاموں سے زیادہ اعلیٰ اور برتر (superior) ہے۔ کسی نے بتایا کہ مغربی تہذیب ایک ایسا درخت ہے جو صرف زہریلے پھل دے سکتا ہے۔ کسی نے بتایا کہ مغربی تہذیب اپنی موت آپ مر رہی ہے، تاکہ مسلمانوں کو دوبارہ ان کا بلند مقام حاصل ہوجائے۔ کسی نے بتایا کہ دنیا کا اسٹیج مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ (renaissance) کا انتظار کر رہا ہے:

مشرق ومغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے ‌ ‌ ‌ ‌ اُٹھ، کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

موجودہ زمانے میں شاعروں اور خطیبوں اور انشا پردازوں کے علاوہ، ایک اور طبقہ پیدا ہوا جس کو مسلم ڈبیٹر (مُناظر) کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے شان دار اسٹیج بنائے اور وہاں پُر جوش تقریریں کیں۔ انھوں نے ٹی وی کے اسکرین پر مناظرانہ مظاہرے کیے۔ انھوں نے مسلم نفسیات کو یہ کہہ کر فرضی فتوحات کی خوراک دی کہ — اِن سب کو بُل ڈوز کردو:

Bulldoze them all.

یہ مسلم ڈبیٹر اِس آخری حد تک گیے کہ جب مسلمانوں کو ٹررسٹ (terrorist) کہا گیا تو انھوں نے کہا کہ ہاں، ہم ٹررسٹ ہیں۔ مگر ہم پولس کی طرح مجرمین کے لیے ٹررسٹ ہیں:

> Every Muslim should be a terrorist. A terrorist is a person who causes terror. The moment a robber sees a policeman, he is terrified. A pliceman is a terrorist for the robber. Similarly, every Muslim should be a terrorist for the anti-social elements of society, such as thieves, dacoits and rapists.

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو قطب اور اقبال اور مودودی اور احمد دیدات کے ذریعے اسلام ملا، وہ دراصل ایک شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ قومی اسلام کو ربّانی اسلام کا درجہ دے رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ صرف یہ تھا کہ انھوں نے اِن حضرات کے ذریعے اپنے قومی فخر کو دوبارہ حاصل کرلیا، مگر غلط فہمی کی بنا پر انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اُن کو حقیقی اسلام حاصل ہوگیا ہے۔

اِسی قسم کے ایک مسلمان مسٹر مراد سے 2 اگست 2007 کو میری ملاقات دہلی میں ہوئی۔ اُن

کے والدین شام سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر وہ شام کو چھوڑ کر ترکی گیے۔ پھر ترکی سے وہ آسٹریلیا منتقل ہوگیے۔ اِس وقت یہ فیملی آسٹریلیا میں رہ رہی ہے۔ مسٹر مراد کی تعلیم آسٹریلیا کے اسکول اور کالج میں ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ یہ اسکول ایک کرسچن اسکول تھا۔ وہاں انھیں بتایا جاتا تھا کہ عیسائیت (Christianity) زیادہ اچھا مذہب ہے، اور اسلام اُس کے مقابلے میں کم تر مذہب ہے۔

وہ اسلام کی اِس منفی تصویر سے سخت پریشان تھے۔ پھر انھیں احمد دیدات جیسے لوگوں کو سننے کا موقع ملا۔ اِس سے اُن کے ذہن میں اسلام کی عظمت (glory) دوبارہ لوٹ آئی۔ وہ اسلام کو اپنے لیے فخر کی ایک چیز سمجھنے لگے۔ پھر اسی مجلس میں انھوں نے بتایا کہ میں تاج محل دیکھنے کے لیے آگرہ گیا تھا۔ مجھے تاج محل دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ میں نے سوچا کہ تاج محل کو بنانے والے مسلمان تھے، مگر آج ہندو لوگ اُس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ کی اِس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو احمد دیدات جیسے لوگوں کے ذریعے جو اسلام ملا ہے، وہ اسلام نہیں ہے، بلکہ صرف قومی فخر ہے۔ اگر آپ کو حقیقی اسلام ملا ہوتا تو آپ تاج محل کے بارے میں اِس قسم کی منفی بات نہ کہتے۔ پھر میں نے کہا کہ آپ کو انڈیا میں صرف تاج محل دکھائی دیا۔ انڈیا میں اس کے مقابلے میں ہزاروں گنا زیادہ بڑی چیز موجود ہے، اور وہ دعوتی عمل کی آزادی ہے۔ تاج محل کو لے کر آپ کا ذہن منفی سوچ کا شکار ہوگیا، حالاں کہ اگر آپ انڈیا میں موجود دعوتی مواقع کو لے کر سوچتے تو آپ کا دل شکر کے جذبات سے بھر جاتا۔

میرے تجربے کے مطابق، یہی اُن تمام لوگوں کا معاملہ ہے جو شاعروں اور مُناظروں کی باتوں کو سُن کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اسلام کو پالیا ہے، حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ جس چیز کو انھوں نے دریافت کیا ہے، وہ اسلام کے نام پر محض فخر (pride) ہے۔ اور فخر صرف ایک مذموم چیز ہے، نہ کہ کوئی پسندیدہ چیز۔

کسی آدمی نے حقیقی اسلام کو پایا ہے یا نہیں، اُس کا معیار صرف ایک ہے، اور وہ فکرِ آخرت ہے۔ جس آدمی کا اسلام اُس کے اندر گہرے طور پر آخرت کی فکر پیدا کردے، اُسی نے فی الحقیقت

اسلام کو پایا۔ جس آدمی کا اسلام اُس کو جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو نہ دکھائے، اُس نے اسلام کو پایا ہی نہیں۔ اُس نے کسی اور چیز کو پایا ہے اور غلطی سے وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اُس نے اسلام کو پالیا ہے۔

اسلام کا آغاز، خدا کی دریافت (معرفت) سے ہوتا ہے۔ خدا کی دریافت ایک ایسی بالاتر ہستی کی دریافت ہے جو انسان کا خالق ہے، جو انسان کا مالک ہے، جس نے انسان کو زندگی کے تمام سامان دیے ہیں۔ جب انسان خدا کو دریافت کرتا ہے تو اُسی کے ساتھ وہ یہ بھی دریافت کرتا ہے کہ انسان کے بارے میں خدا کا تخلیقی نقشہ (creation plan) کیا ہے۔ خدا کا یہ تخلیقی نقشہ اُس کو بتاتا ہے کہ دنیا میں جو سامانِ حیات اُس کو ملے ہوئے ہیں، وہ سب کے سب امتحان کے پرچے ہیں۔ یہ چیزیں اُس کو حق کے طور پر نہیں ملی ہیں، بلکہ وہ اِس لیے ملی ہیں کہ اُن کے ذریعے انسان کو جانچ کر دیکھا جائے کہ وہ جہنم کی سزا کے قابل ہے، یا جنت کے انعام کے قابل۔

یہ دریافت اُس کو آخری حد تک تڑپا دیتی ہے۔ دنیا کی چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے، ہر وقت اُس کو قرآن کی یہ آیت یاد آتی ہے: ثمّ لتسئلن یومئذ عن النّعیم (التّکاثر: 8) یعنی پھر یقیناً تم سے اُس دن نعمتوں کے بارے میں ضرور پوچھا جائے گا۔ پھر خدا کی معرفت اور جنت اور جہنم کا یقین اور مواخذۂ آخرت (accountability) کا شدید احساس، اُس کو ایسا بنا دیتا ہے کہ اِس دنیا میں میرا کوئی حق (right) نہیں، یہاں میری صرف ذمّے داریاں (responsibilities) ہی ذمّے داریاں ہیں۔

یہ احساس اُس کو آخری حد تک فرض شناس (duty conscious) بنا دیتا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسا ذہن بنتا ہے جس میں دوسروں کے خلاف نفرت اور شکایت کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنی ذمّے داریوں کو سوچتا ہے، نہ کہ دوسروں کی کوتاہیوں کو۔ اُس کی نظر ہمیشہ اپنی غلطیوں پر ہوتی ہے، نہ کہ دوسروں کی زیادتیوں پر۔ اُس کا دل دوسروں کے لیے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔

دیوارِ قہقہہ

The story of the wall of laughter

ایک پُرانا قصہ ہے کہ کسی مقام پر ایک مضبوط دیوار تھی۔ یہ دیوار بہت اونچی تھی۔ اِسی کے ساتھ وہ دونوں طرف بہت زیادہ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کو کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ دیوار کے دوسری طرف کیا ہے، اور کس قسم کے لوگ اُدھر رہتے ہیں۔ دیوار کے ایس طرف جو لوگ رہتے تھے، انھوں نے یہ چاہا کہ دیوار کے دوسری طرف کا حال معلوم کریں۔

اِس مقصد کے لیے انھوں نے ایک بہت لمبی سیڑھی بنائی، پھر انھوں نے اُس سیڑھی کو دیوار کے ایک طرف کھڑا کیا اور اپنے ایک آدمی کو سیڑھی پر چڑھایا، تاکہ وہ دیوار کے اوپر تک جائے اور وہاں سے دیکھے کہ دیوار کے دوسری طرف کیا ہے۔ اِس مشاہدے کے بعد وہ نیچے آکر دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کو دیوار کے دوسری طرف کا حال بتائے۔ لیکن جب یہ آدمی لمبی سیڑھی پر چڑھ کر دیوار کے اوپر پہنچا تو دوسری طرف کی دنیا اُس کو اتنی زیادہ خوب صورت معلوم ہوئی کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور قہقہہ لگا کر دیوار کے دوسری طرف کود پڑا۔

اِس کے بعد دیوار کے اِس طرف رہنے والوں نے اپنے ایک اور آدمی کو تیار کیا اور اس کو لمبی سیڑھی کے اوپر چڑھایا، لیکن دوبارہ یہی ہوا کہ جب وہ آدمی دیوار کے اوپر پہنچا تو قہقہہ لگا کر وہ دوسری طرف کود پڑا۔ یہ تجربہ بار بار کیا جاتا رہا، لیکن ہر بار یہی ہوا کہ اوپر چڑھنے والے آدمی کو دوسری طرف کا منظر اتنا پُرکشش نظر آیا کہ وہ قہقہہ لگا کر دیوار کے دوسری طرف کود پڑا۔ اِس طرح دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کے لیے دیوار کے دوسری طرف کا حال بدستور نامعلوم بنا رہا۔

اِس افسانوی دیوار کو اگر موت کی دیوار مانا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ انسان کی زندگی کا ایک حصہ دیوار کے اِس طرف ہے، اور اس کا دوسرا حصہ دیوار کے دوسری طرف۔ دیوار کے دوسری طرف خوشیوں کی دنیا، یا دوسرے لفظوں میں، جنت کی دنیا بسی ہوئی ہے اور دیوار کے اِس طرف محنت اور

مشقت کی دنیا ہے، تو یہ کہانی انسانی تاریخ کے اوپر مکمل طور پر صادق آئے گی۔ یہ تمثیلی کہانی گویا کہ پوری انسانی تاریخ کی کہانی ہے۔

انسان پیدائشی طور پر اپنے لیے خوشیوں کی ایک زندگی چاہتا ہے۔ اِس اعتبار سے انسان کو متلاشیٔ مسرت حیوان (joy-seeking animal) کہا جاسکتا ہے۔ قدیم انسان نے جب یہ دیکھا کہ اُس کی زندگی مختلف قسم کے غم سے بھری ہوئی ہے، تو اس نے اپنے لیے ایک پُر مسرت زندگی کی تلاش شروع کردی۔ اِس تلاش کا غالباً پہلا نمایاں واقعہ پہیہ (wheel) کی دریافت تھی۔ پہیے کی دریافت کے بعد تلاشِ مسرت کا یہ انسانی سفر شروع ہوگیا۔ اِس سفر کو ایک متعین نام دینا ہو تو اُس کو تہذیب (civilization) کا سفر کہا جاسکتا ہے۔ تہذیب کا یہ سفر چلتا رہا۔ لمبی مدت کے بعد آخرکار یہ سفر جدید تہذیب (modern civilization) کے دَور تک پہنچ گیا۔ اب اُس کو تیز رفتار سفر کے لیے مشین کی طاقت حاصل ہوگئی۔ جدید کمیونی کیشن کا زمانہ آیا اور جسمانی سفر کے بغیر انسان کی آواز اور اس کی متحرک تصویر بعید ترین مسافت تک پہنچنے لگی۔ جدید انڈسٹری نے کنزیومرازم (consumerism) کا دور پیدا کیا، جب کہ راحت اور آسائش کی تمام چیزیں غلّے اور سبزی کی طرح بازار میں بکنے لگیں، وغیرہ۔

اِس طرح انسانی تہذیب کامیابی کے ساتھ لمبا سفر طے کرتے ہوئے آخرکار اکیسویں صدی عیسوی میں پہنچ گئی، لیکن اِس آخری منزل پر پہنچ کر انسان کے لیے ایک نیا شدید تر مسئلہ پیدا ہوگیا۔ اب یہ ہوا کہ دیوارِ قہقہہ (laughter wall) اُن کے لیے ایک نئی قسم کی دیوارِ گریہ (wailing wall) بن گئی۔ اب معلوم ہوا کہ انسان نے لمبی جدو جہد کے بعد جو دنیا اپنے لیے بنائی تھی، وہ انسان کے لیے خوشیوں کی دنیا نہ تھی، بلکہ وہ صرف نئی ناقابلِ عبور مصیبتوں کی ایک دنیا تھی۔ چناں چہ اکیسویں صدی میں انسانی تہذیب ایک بند گلی (blind alley) تک پہنچ کر انسانی تاریخ کے خاتمہ (end of history) کے ہم معنیٰ بن گئی۔

ایسا کیوں ہوا۔ اِس کا سبب بنیادی طور پر صرف ایک ہے، وہ یہ کہ خوشیوں کی ایک دنیا بنانے کے لیے ایک مکمل انڈسٹری درکار ہے۔ انسان نے لمبی جدو جہد کے بعد ایک ایسی انڈسٹری تیار کی، لیکن جب یہ انڈسٹری

تیار ہوگئی تو اس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ انڈسٹری ایک نیا ناقابلِ عبور مسئلہ لے کر آئی ہے۔ یہ مسئلہ فضائی کثافت (air pollution) کا مسئلہ ہے، جو کہ انسانی انڈسٹری کے ساتھ لازمی طور پر جُڑا ہوا ہے۔ ہم کو اپنی مطلوب راحتوں کی دنیا بنانے کے لیے بے کثافت انڈسٹری (pollution-free industry) درکار ہے، اور بے کثافت انڈسٹری کو وجود میں لانا انسان کے لیے سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اِس طرح کثافت کے مسئلے نے عملی طور پر تہذیب کے تمام ثَمرات (achievements) کی نفی کردی ہے۔

ایک طرف، اپنی مطلوب دنیا بنانے کے لیے انسان کے عجز کا یہ معاملہ ہے اور دوسری طرف، اِسی دنیا میں یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ یہاں ایک بے کثافت انڈسٹری عملاً ہزاروں سال سے مکمل طور پر قائم ہے۔ یہ فطرت (nature) کی انڈسٹری ہے۔ تہذیب، بے کثافت انڈسٹری کو وجود میں لانے میں مکمل طور پر ناکام رہی، لیکن اِسی دنیا میں فطرت (nature) ایک مکمل قسم کی بے کثافت انڈسٹری بہت بڑے پیمانے پر بالفعل (in action) قائم کیے ہوئے ہے۔

موجودہ سیارۂ زمین جس پر انسان رہتا ہے، وہ مسلسل طور پر گردش میں ہے۔ وہ اپنے محور (axis) پر ایک ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے گھوم رہا ہے۔ اِسی کے ساتھ وسیع خلا میں سورج کے گرد وہ اپنے مدار (orbit) پر 19 کروڑ میل کا لمبا سفر طے کرتا ہے، پہلا سفر 24 گھنٹے میں پورا ہوتا ہے اور دوسرا سفر ایک سال میں۔ سیارۂ زمین کا یہ دوطرفہ تیز رفتار سفر مسلسل طور پر جاری ہے، لیکن یہاں نہ کوئی شور (noise) ہے اور نہ کسی قسم کی کثافت (pollution)۔

سورج آگ اور انرجی کا بہت بڑا ابھنڈار ہے۔ وہ اتنا زیادہ بڑا ہے کہ اُس سے 12 لاکھ زمینیں بن سکتی ہیں۔ وہ زمین سے 9 کروڑ 30 لاکھ میل دور رہتے ہوئے مسلسل طور پر ہم کو روشنی اور حرارت بھیج رہا ہے، لیکن دوبارہ یہاں کسی قسم کی کوئی کثافت (pollution) مطلق موجود نہیں۔ اِسی طرح نیچر میں ایک اور انڈسٹری ہے۔ یہ درختوں اور پودوں کی صورت میں قائم ہے۔ یہ انڈسٹری ایک نہایت پیچیدہ نظام کے تحت، انسان کو مسلسل طور پر صحت بخش آکسیجن سپلائی کر رہی ہے۔ اِسی کے ساتھ وہ ہماری سانس سے نکلی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنے اندر جذب کر رہی ہے۔ یہ بلاشبہہ ایک عظیم انڈسٹری

ہے، لیکن یہ انڈسٹری بھی شور اور کثافت جیسی نامطلوب چیزوں سے مکمل طور پر پاک ہے۔

اِسی طرح پانی کو دیکھیے۔ پانی کا بہت بڑا ذخیرہ بڑے بڑے سمندروں کی صورت میں ہماری زمین پر موجود ہے۔ اِس ذخیرے میں تحفظّاتی مادّہ (preservative) کے طور پر تقریباً 10 فی صد نمک ملا ہوا ہے۔ اِس بنا پر وہ براہِ راست طور پر انسان کے لیے قابلِ استعمال نہیں۔ یہاں بارش کی صورت میں ایک عظیم آفاقی عمل جاری ہے، جس کو ازالۂ نمک (desalination) کا عمل کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ناقابلِ بیان حد تک ایک عظیم انڈسٹری ہے، لیکن یہ انڈسٹری کسی قسم کی کوئی کثافت پیدا نہیں کرتی۔

یہی معاملہ انسانی خوراک کا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ خوراک غلّہ اور سبزی اور پھل اور دودھ اور مچھلی اور گوشت، وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تمام خوراک بھی مسلسل طور پر انسان کے لیے وجود میں لائی جارہی ہے۔ یہ عمل بھی ایک عظیم انڈسٹری کے ذریعے انجام پاتا ہے، لیکن یہاں بھی انسانی صنعتوں کی مانند کوئی کثافت پیدا نہیں ہوتی۔

یہ دو مختلف قسم کے تجربے ہیں۔ ایک، انسانی تہذیب کی انڈسٹری اور دوسرے، ڈوائن نیچر کی انڈسٹری۔ انسانی تہذیب کی انڈسٹری ہمارے لیے خوشیوں اور راحتوں کی دنیا بنانے میں ناکام ہے۔ وہ راحت کے سامان وجود میں لانے کی کوشش میں مصیبتوں کا ایک نیا جنگل اُگا دیتی ہے۔ دوسری طرف، عین اُسی وقت، ڈوائن نیچر کی انڈسٹری راحت کے تمام سامان پیدا کررہی ہے، لیکن وہ مکمل طور پر ایک بے کثافت انڈسٹری ہے، نہ کہ انسانی انڈسٹری کی طرح پُر کثافت انڈسٹری۔

اب اگر قدیم کہانی کے مطابق، دیوار کو موت کی دیوار قرار دیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اِس دیوار کے ایک طرف دنیائے گریہ (wailing world) ہے، اور اِس دیوار کے دوسری طرف دنیائے قہقہہ (laughter world) ہے۔ اکیسویں صدی میں پہنچ کر تہذیبِ انسانی کی ناکامی ہمیں ایک نیا پُر امید سبق دے رہی ہے، وہ یہ کہ ہم ''دیوار'' کے اِس طرف ناکام طور پر اپنی دنیائے قہقہہ بنانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ ''دیوار'' کے دوسری طرف کی ''دنیائے قہقہہ'' میں اپنی سیٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں، جو کہ بَر وقت ہی ڈوائن نظام کے تحت ''دیوار'' کے دوسری طرف موجود ہے۔

جنت اور انسان

غالباً 1998 کی بات ہے، ڈاکٹر مہیش چندر شرما نے مجھے دہلی کے ایک سینئر اسکالر سے ملایا۔ یہ پروفیسر نونہال سنگھ (پیدائش: 1923) تھے۔ امریکا سے رٹائر ہوکر آنے کے بعد یہاں ان کو راجیہ سبھا کا ممبر (1998-1992) بنادیا گیا تھا۔ اُن کا گھر ایک کتب خانہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس میں ہر طرف لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا۔ وہ پورے معنوں میں ایک اسکالر دکھائی دیتے تھے۔

ملاقات کے وقت انھوں نے بتایا کہ پولٹکل سائنس میں انھوں نے ایم اے کیا تھا۔ اِس کے بعد انھوں نے انٹرنیشنل ریلیشنس (international relations) کے سبجیکٹ پر ڈاکٹریٹ کیا۔ اُس زمانے میں امریکا کی ایک یونی ورسٹی کو اپنے لیے اِس موضوع پر ایک پروفیسر کی ضرورت تھی۔ اُس کا اشتہار دیکھ کر پروفیسر سنگھ نے اس کے لیے اپنی درخواست بھیج دی۔ جلد ہی انھیں یونی ورسٹی کی طرف سے ایک لیٹر ملا، اِس میں انھیں انٹرویو کے لیے امریکا بلایا گیا تھا۔

وہ امریکا پہنچے تو ائرپورٹ پر ایک صاحب اُن سے ملے۔ اُنھوں نے کہا کہ میں یونی ورسٹی کی طرف سے بھیجا گیا ہوں، تاکہ یہاں میں آپ کو گائڈ کروں۔ اِس کے بعد اُس آدمی نے پروفیسر سنگھ کو اپنی گاڑی پر بٹھایا اور اُن کو لے کر یونی ورسٹی پہنچا۔ یونی ورسٹی میں پروفیسر سنگھ کو وہاں کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھیرایا گیا۔

اِس کے بعد وہ آدمی روزانہ پروفیسر سنگھ کے پاس آتا اور ان کو لے کر صبح سے شام تک یونی ورسٹی کے وسیع کیمپس میں گھماتا رہتا۔ اِس طرح وہ آدمی پروفیسر سنگھ کو یونی ورسٹی کے ہر شعبے میں لے گیا اور یونی ورسٹی کی ہر سرگرمی میں انھیں شامل کیا۔ مثلاً لائبریری، ڈائننگ ہال، کلاس روم، ٹیچرس کلب، اسٹوڈنٹس میٹنگ، یونی ورسٹی ورکرس، وغیرہ۔

اِس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ پروفیسر سنگھ کو تشویش ہوئی۔ انھوں نے اپنے ڈپارٹمنٹ کے چیئر مین سے کہا کہ میں ایک ہفتے سے یہاں ہوں۔ مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا، لیکن اب تک میرا انٹرویو نہیں ہوا۔ چیئر مین نے کہا کہ آپ کا انٹرویو ہو چکا ہے۔ ہم نے آپ کا سلیکشن کرلیا ہے، اور اب

آپ کل سے ہمارے یہاں جوائن کر لیجیے۔ اِس کے بعد چیئر مین نے بتایا کہ ائر پورٹ پر ہمارا جو آدمی آپ سے ملا تھا، وہ یہاں کا سینئر پروفیسر تھا۔ اور وہی آپ کا انٹرویور بھی تھا۔

چیئر مین نے کہا کہ آپ کے بھیجے ہوئے کاغذات کو دیکھنے کے بعد ہم نے جان لیا تھا کہ جہاں تک تعلیمی لیاقت کا تعلق ہے، آپ اس کے پوری طرح اہل ہیں۔ اب ہم کو یہ جاننا تھا کہ آپ ہمارے یونی ورسٹی کلچر کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ آپ کا مذکورہ انٹرویور یہی کام کر رہا تھا۔ وہ آپ کو یونی ورسٹی کے ہر شعبے میں لے گیا۔ اس نے یہاں کی تمام ایکٹوٹیز (activities) سے آپ کو متعارف کرایا۔ اس نے اسٹوڈنٹس اور ٹیچرس دونوں کے ساتھ آپ کے سلوک کو دیکھا۔ اِس دوران وہ آپ کی ہر بات کا دقّتِ نظر کے ساتھ معائنہ کرتا رہا۔ انٹرویور کی رپورٹ آپ کے بارے میں پوری طرح مثبت ہے۔ چناں چہ آپ کے ریکارڈ کو دیکھنے کے بعد ہم نے آپ کا انتخاب کر لیا ہے۔ آپ کل سے یہاں اپنا کام شروع کر دیں۔

یہ واقعہ ایک حقیقی مثال کی صورت میں، جنت اور انسان کے معاملے کو بتاتا ہے۔ خدا نے ایک وسیع دنیا بنائی، جنت کی دنیا۔ یہ دنیا پورے معنوں میں ایک کامل دنیا تھی۔ یہاں ہر چیز اعلیٰ معیار کے مطابق تھی۔ خدا نے چاہا کہ اِس کامل دنیا میں وہ ایسے لوگوں کو بسائے جو اپنے کردار کے اعتبار سے اُس کے لیے پوری طرح اہل ہوں، جو اِس معیاری دنیا میں معیاری انسان کی حیثیت سے رہ سکیں۔

اب خدا نے اِس دنیا کے تعارفی نمونے کے طور پر موجودہ زمینی سیّارہ بنایا۔ یہاں وہ ساری چیزیں پائی جاتی ہیں جو جنتی دنیا کے اندر موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جنتی دنیا، معیاری دنیا (perfect world) ہے اور موجودہ زمینی دنیا، غیر معیاری دنیا (imperfect world)۔ جنتی دنیا کامل ہے اور موجودہ زمینی دنیا غیر کامل۔ جنتی دنیا ابدی ہے اور موجودہ زمینی دنیا غیر ابدی۔ جنتی دنیا ہر قسم کے خوف اور حُزن سے خالی ہے، جب کہ موجودہ دنیا کا حال یہ ہے کہ وہ خوف اور حزن سے بھری ہوئی ہے۔ جنتی دنیا انعام (reward) کی دنیا ہے اور موجودہ دنیا آزمائش (test) کی دنیا۔

اِس منصوبے کے تحت، خدا نے انسان کو پیدا کر کے اس کو موجودہ زمینی دنیا میں بسایا۔ خدا نے انسان کو کامل آزادی دے دی۔ اُس نے انسان کو یہ موقع دیا کہ وہ یہاں کسی پابندی کے بغیر رہے۔

اُس کواختیار رہے کہ وہ اپنی آزادی کو چاہے تو غلط طور پر استعمال کرے اور چاہے تو درست طور پر استعمال کرے۔ ہر انسان جو زمین پر پیدا ہوتا ہے، اُس کے ساتھ خدا کے دو غیر مَرئی (invisible) فرشتے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ وہ انسان کے ہر قول اور عمل کا مکمل ریکارڈ تیار کررہے ہیں۔ اِسی ریکارڈ کی بنیاد پراس کے لیے اگلی دنیا میں جنت یا جہنم کا فیصلہ ہوگا۔

جنتی دنیا میں انسان کامل آزادی کے ساتھ رہے گا، لیکن وہ اتنا زیادہ پختہ اور اتنا زیادہ باشعور ہوگا کہ وہ کسی بھی حال میں اپنی آزادی کا غلط استعمال نہیں کرے گا۔ وہ پوری طرح آزاد ہوتے ہوئے بھی پوری طرح ڈسپلن میں رہے گا۔ یہی وہ انسان ہے جس کے سلیکشن کے لیے موجودہ زمینی سیّارہ بنایا گیا۔ موجودہ دنیا میں بھی وہ سارے حالات پائے جاتے ہیں جو جنتی دنیا میں موجود ہوں گے۔ اب یہ دیکھا جارہا ہے کہ وہ کون انسان ہے جس نے ہر قسم کے حالات سے گزرتے ہوئے جنتی کیریکٹر کا ثبوت دیا۔ اُسی انسان کا انتخاب کرکے اس کو جنتی دنیا میں ابدی طور پر بسا دیا جائے گا۔

ہر انسان کے ساتھ خدا کے غیر مرئی فرشتے لگے ہوئے ہیں اور وہ ہر لمحہ اس کا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔ یہی انسان کا ٹسٹ ہے، اور اِسی ٹسٹ کے نتیجے کی بنیاد پر ہر آدمی کے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ ٹسٹ یہ ہے کہ آدمی ہر موقع پر خدائی کی بڑائی کا اعتراف کرے، یعنی آدمی کے ضمیر نے جب اس کوٹوکا تو اس نے ضمیر کی آواز کو مانا، یا اس کو نظر انداز کردیا۔ جب اس کے سامنے دلیل کے ساتھ ایک سچائی آئی تو وہ اس کے آگے جھک گیا، یا اس نے اس کے خلاف سرکشی دکھائی۔ جب اپنی انا اور سچائی کا مقابلہ ہوا تو وہ اپنی انا کے پیچھے چلا، یا اُس نے سچائی کا اعتراف کیا۔

اِسی طرح لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ انصاف پر قائم رہا، یا اپنے انٹرسٹ کی خاطر بے انصافی کرنے لگا۔ وہ صرف لوگوں کے سامنے اچھا بنا رہا، یا اپنی پرائیویٹ زندگی میں بھی وہ اچھائی پر قائم رہا۔ اس نے حق کو اپنا سپریم کنسرن بنایا، یا حق کے سوا کسی اور چیز کو وہ اپنا کنسرن بنائے رہا۔ اسی طرح یہ کہ جب اس کو اقتدار ملا تو وہ بگاڑ کا شکار ہوگیا، یا اقتدار کے باوجود اس نے اپنے آپ کو انصاف پر قائم رکھا۔ جب اس کو دولت حاصل ہوئی یا اس کو غریبی کا تجربہ ہوا تو دونوں حالتوں میں یکساں طور پر اس نے اعتدال کا ثبوت دیا، یا وہ اعتدال کے راستے سے

ہٹ گیا۔ سماجی زندگی میں جب اس کو آگے کی سیٹ ملی، اس وقت وہ کیسا تھا اور جب اس کو پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنا پڑا تب اس کا رویہ کیا تھا۔ اس نے اپنے جذبات اور اپنی خواہشوں کو اصول کا پابند رکھا، یا اصول سے ہٹ کر وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلنے لگا۔ اِسی ریکارڈ کی بنیاد پر ہر عورت اور مرد کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

موجودہ زمینی دنیا ایک محدود مدت کے لیے بنائی گئی ہے۔ اِس مدت کے پورا ہونے کے بعد یہاں پیدا ہونے والے تمام انسان، خدا کے سامنے حاضر کیے جائیں گے۔ خدا، فرشتوں کے تیار کیے ہوئے ریکارڈ کے مطابق، ہر ایک کے مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ جس عورت یا مرد کا ریکارڈ بتائے گا کہ وہ زمینی دنیا میں جنتی کردار کے ساتھ رہا، اُس نے اپنی آزادی کو خدا کے مقرر کیے ہوئے دائرے کے اندر استعمال کیا اور اِس طرح یہ ثابت کیا کہ وہ جنتی دنیا کے ماحول میں بسائے جانے کے قابل ہے، ایسے لوگوں کو جنت کے باغوں میں رہنے کے لیے منتخب کرلیا جائے گا۔ اور وہ تمام لوگ جو جنتی کردار کا ثبوت نہ دے سکے، اُن کو رد کر کے کائنات کے ابدی کوڑے خانے میں ڈال دیا جائے گا، تا کہ وہ ہمیشہ کے لیے مایوسی اور حسرت کی زندگی گزارتے رہیں اور کبھی اُس سے چھٹکارا نہ پاسکیں۔

ابدی صحرا

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (9 فروری 2008) میں ایک سبق آموز واقعہ نظر سے گزرا۔ بمبئی کے ایک ایکٹر آنند سوریا ونشی (Anand Suryavanshi) نے اپنی بڑی موٹر کار گورے گاؤں (بمبئی) میں پے اینڈ پارک ایریا (pay-and park area) میں کھڑی کی۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس آئے تو ان کی کار وہاں موجود نہ تھی۔ وہ چوری ہوچکی تھی۔ انھوں نے اخبار کے رپورٹر آلیورا (Roshni Olivera) کو بتایا کہ اِس کار میں میری تمام ذاتی چیزیں موجود تھیں۔ مثلاً لیپ ٹاپ، قیمتی اسٹون رِنگ، 30، 40 ڈی وی ڈیز (DVDs)، تقریباً 50 سی ڈیز (CDs)، شوٹنگ کے کپڑے، موبائل فون، اور پرسنل ڈائری، وغیرہ۔ مسٹر آنند نے کہا کہ میں اِن چیزوں سے جذباتی طور پر وابستہ تھا:

I was emotionally attached to them.

اِس قسم کی تفصیلات کو بتاتے ہوئے انھوں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ — اِس حادثے کے بعد مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کہ میں اچانک کسی ویران جزیرے میں آکر پھنس گیا ہوں:

I feel like I am stranded on some island (p. 4)

یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانے پر آخرت میں پیش آئے گا۔ موت کے پہلے کی زندگی میں آدمی ہر قسم کے ساز وسامان میں جیتا ہے۔ مکان، گاڑی، اولاد، بزنس، شہرت، بینک بیلنس، وغیرہ۔ موت کے بعد کی زندگی میں آدمی اچانک اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں پائے گا۔ یہاں وہ پوری طرح اکیلا ہوگا۔ اس کے تمام مادّی سامان اُس سے چھوٹ چکے ہوں گے۔ اُس کے پیچھے وہ دنیا ہوگی جس کو وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا۔ اُس کے آگے وہ دنیا ہوگی جہاں اُس کے لیے ابدی صحرا کے سوا اور کچھ نہیں۔ موت سے پہلے آدمی اِس آنے والے دن کے بارے میں سوچ نہیں پاتا۔ موت کے بعد اچانک یہ دن آجائے گا۔ اُس وقت انسان سوچے گا، لیکن اس کا سوچنا اس کے کام نہ آئے گا۔ سب سے بڑی عقل مندی یہ ہے کہ آدمی اِس آنے والے ہولناک دن کی تیاری کرے۔

دورِ امن کا آغاز

جنوری 2008 میں ایک غیر متوقع خبر میڈیا میں آئی۔ وہ یہ کہ متشددانہ جہاد کے لیڈر اسامہ بن لادن کے ایک بیٹے نے اعلان کیا کہ وہ اپنے باپ سے الگ ہوگئے ہیں اور اب وہ امن کے لیے کام کریں گے۔ عمر بن اُسامہ کی عمر 26 سال ہے۔ انھوں نے ایک انگریز خاتون (Jane Felix-Browne) سے شادی کی ہے۔ اُن کا موجودہ نام زَینہ الصباح (Zaina Alsabah) ہے۔ خاتون کی عمر 52 سال ہے۔ عمر بن اسامہ نے یہ اعلان کیا ہے کہ میرے باپ اسامہ بن لادن نے تشدد کا طریقہ اختیار کیا۔ مگر وہ طریقہ غلط تھا۔ اب میں مسلمان اور مغربی دنیا کے درمیان ایمبیسڈر آف پیس (ambassador of peace) کا کردار ادا کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ اِس مقصد کے لیے وہ نارتھ افریقہ میں پانچ ہزار کلو میٹر کی ایک ہارس ریس (horse race) کریں گے۔ انگریزی اخبار (The Times of India) کے شمارہ 19 جنوری 2008 میں یہ خبر اِس عنوان کے تحت چھپی ہے — اسامہ کا بیٹا امن کا پیام بَر بننا چاہتا ہے:

Osama's son wants to be a peacenik

انھوں نے کہا کہ — اسلام کے دفاع کے لیے القاعدہ کی اختیار کردہ ملیٹنسی سے زیادہ بہتر طریقہ اسلام میں موجود ہے:

There is a better way to defend Islam,
than Al-Qaida's militancy (p. 22)

عمر بن اسامہ بن لادن نے مذکورہ بات اسوسی ایٹیڈ پریس (A.P.) کے ساتھ اپنے انٹرویو میں کہی تھی۔ اس کے بعد مشہور ٹی وی چینل سی این این (CNN) نے اُن سے انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو مختلف اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (23 جنوری 2008) نے اِس کی رپورٹ مندرجہ ذیل عنوان کے تحت چھاپی ہے:

Osama's son wants father to 'give up violence, find another way'

Osama's son wants father to 'give up violence, find another way'

Washington: Elusive al-Qaida mastermind Osama-bin Laden may have terrorised the world, but his 26-year-old son Omar wants to launch *"a movement of peace"* and wishes his father will give up violence and find "another way" to pursue his goals. Omar, who last saw Osama in 2000 when he decided to leave al-Qaida, said he did not think his father was a terrorist and was sure that he must have felt "very sorry" for the September 11 attacks. In interviews to US news channels, Omar, who works as a contractor, however, expressed apprehensions that his father "doesn't have the power to stop the movement at this moment." Omar, who is the fourth of 11 children born to his Osama's first wife and one of 19 children the al-Qaida leader has fathered, said he is talking publicly because he wants an end to the violence his father has inspired by launching a movement for peace. "I try and say to my father: "Try to find another way to help or find your goal. This bomb, this weapons, it's not good to use it for anybody," he told CNN in broken English. He said that's not just his own message, but one that a friend of his father's and other Muslims have expressed to him. "They too say... my father should change (his) way" He said he has no idea where his father is, but is confident he will never be caught because locals support him. Omar, who has has little in common with his father except his looks minus the beard, grabbed headlines when he married a British national twice his age. "Being Osama's son, I don't hide it. I don't hide my name," he said. "I am proud of my name, but if you have a name like mine you will find people run away from you, are afraid of you." Omar said he doesn't consider his father to be a terrorist. When his father was fighting the Soviets, Washington considered him a hero, he said."Before they call it war; now they call it terrorism," he said. He said his father believes his duty is to protect Muslims from attack. "He believes this is his job - to help the eople," he said. PTI

یہ خبر علامتی طور پر تاریخ میں ایک نئے دور کا اعلان ہے — دورِ تشدد کا خاتمہ، اور دورِ امن کا آغاز۔ یہ نیا دور نظریاتی طور پر شروع ہو چکا ہے۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ عملی طور پر بھی وہ دنیا میں قائم ہو جائے گا۔

بیسویں صدی عیسوی میں تاریخ کی دو سب سے بڑی جنگیں لڑی گئیں، پہلی عالمی جنگ، اور دوسری عالمی جنگ۔ اِن جنگوں میں تقریباً 60 ملین انسان ہلاک ہوگئے۔ اِس عظیم ہلاکت کے بعد انسان کا ضمیر عام طور پر جنگ کے خلاف ہوگیا۔ اِس کے بعد جب دنیا میں عمومی تباہی کے ہتھیار (weapons of mass destruction) آگئے، تو یہ سمجھا جانے لگا کہ اب اِس کا امکان ختم ہوگیا کہ جنگ کے ذریعے کوئی مثبت مقصد حاصل کیا جاسکے۔

اِس عالمی پس منظر کا اثر مسلمانوں کی مسلّح جدوجہد پر بھی پڑا۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے مسلّح جہاد کے نام پر اپنی جان اور اپنے مال کی جو قربانی دی ہے، وہ پوری تاریخ کی تمام قربانیوں سے بھی زیادہ ہے۔ اکیسویں صدی میں پہنچ کر مسلم دنیا میں یہ احساس عام ہوچکا ہے کہ مسلّح جدوجہد اب مسلمانوں کے لیے کوئی قابلِ انتخاب چیز نہیں۔ اِس پس منظر میں اسامہ بن لادن کے بیٹے کا مذکورہ اعلان گویا کہ پوری ملت کی طرف سے ایک نمائندہ اعلان ہے۔ اب تقریباً یقینی ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان جنگ اور تشدد کے راستے کو چھوڑ کر امن اور مفاہمت کا طریقہ اختیار کریں گے اور پھر اپنے مقصد کو زیادہ بہتر طور پر حاصل کرلیں گے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ تاتاری قبائل نے اُس زمانے کی عبّاسی سلطنت کو تباہ کردیا اور مسلم دنیا کے اوپر اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ مگر اِس کے بعد صرف پچاس سال کے اندر یہ واقعہ پیش آیا کہ تاتاریوں کی اکثریت اسلام میں داخل ہوگئی۔ جو لوگ پہلے بظاہر اسلام کے دشمن بنے ہوئے تھے، وہ اب اسلام کے سپاہی بن گئے۔ اِس حیرت ناک تاریخی واقعے کا اعتراف ایک مؤرخ نے اِن الفاظ میں کیا ہے — مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کرلی، جہاں اُن کے ہتھیار ناکام ہوچکے تھے:

The religion of Muslims have conquered,
where their arms had failed.

بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تاریخ دوبارہ دہرائی جانے والی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دوسرا عمل (process) بطور واقعہ شروع ہوچکا ہے۔ آج کل میڈیا میں مسلسل یہ خبریں آرہی ہیں کہ ساری دنیا میں، خاص طور

پر مغربی ممالک میں، لوگ تیزی سے اسلام قبول کررہے ہیں۔ برطانیہ اور امریکا میں یہ تعداد بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ بظاہرِ حالات، یقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ عمل اب رکنے والا نہیں۔

اسلام کی یہ فکری اشاعت کوئی اتفاقی بات نہیں۔ وہ موجودہ زمانے کے حالات کا ایک فطری نتیجہ ہے۔ موجودہ زمانے میں سائنس کے زیر اثر توہماتی طرزِ فکر کا خاتمہ ہوگیا۔ لوگ قدیم طرز کے تعصّباتی مزاج سے بلند ہوکر مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے لگے۔ جدید کمیونکیشن نے اسلام کی معلومات کو ہر آدمی کے لیے قابلِ حصول بنا دیا۔ موجودہ زمانہ جس کو گلوبلائزیشن کا زمانہ کہا جاتا ہے، وہ دراصل گلوبل انٹریکشن کا زمانہ تھا۔ اِس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ مسلمان ساری دنیا کے لوگوں سے ملنے لگے، اور اِس طرح انٹریکشن کے دوران اسلام کا پیغام عالمی سطح پر لوگوں تک پہنچنے لگا، وغیرہ۔

اِس طرح کے مختلف واقعات جو موجودہ زمانے میں پیش آئے، وہ سب کے سب اسلام کے لیے ایک موافق زمین بنانے کے ہم معنٰی تھے۔ ظاہری سطح پر خواہ کتنے ہی غیر موافق اسباب دکھائی دیتے ہوں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے جدید دنیا براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اسلام کی موافقت میں تھی۔ جدید دنیا کا یہ مثبت پہلو اب بطور واقعہ دکھائی دینے لگا ہے۔ اسلامی دعوت اب خود تاریخی عمل (historical process) میں شامل ہوچکی ہے، اور جو فکر خود تاریخی عمل میں شامل ہوجائے، اُس کا اپنے آخری انجام تک پہنچنا اتنا ہی ممکن ہوجاتا ہے جتنا کہ رات کے بعد سورج کا نکلنا۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے جو مسلّح جہاد شروع کیا، وہ اسلامی دعوت کے اعتبار سے کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) بن گیا۔ مسلمانوں نے جن قوموں کے خلاف مسلح جہاد شروع کیا، وہ سب اسلامی دعوت کے اعتبار سے مدعو قومیں تھیں، یعنی مسلمان داعی تھے اور وہ مدعو۔ اسلامی دعوت کا تقاضا تھا کہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات قائم ہوں۔ کیوں کہ جب داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات ہوں، تو دعوت کا عمل کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہتا ہے۔ اور جب داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات باقی نہ رہیں، تو دعوت کا عمل بھی ختم ہوجاتا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی پوری کی پوری مسلمانوں کی طرف سے مدعو قوموں کے خلاف مسلح جہاد کی

صدی تھی۔ یہ مسلح جہاد خدا کے منصوبے کے خلاف تھا، اِس لیے وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ اب جان ومال کی تباہی کے بعد مسلمان مجبور ہوچکے ہیں کہ وہ مسلح جہاد کے اِس عمل کو چھوڑ دیں۔ حالات بتاتے ہیں کہ اب عملاً اِس کا آغاز ہوچکا ہے۔

غیر مطلوب مسلح جہاد کا ختم ہونا، اپنے آپ میں دعوتی عمل کا آغاز ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب حالات معتدل ہوجائیں تو لوگ کسی نفسیاتی رکاوٹ کے بغیر اسلام کا مطالعہ شروع کردیتے ہیں، اور عین اپنی فطرت کے مطابق پاکر اس کو اختیار کرلیتے ہیں۔ بیسویں صدی اگر غیر مطلوب مسلح جہاد کی صدی تھی، تو اکیسویں صدی مطلوب دعوت کی صدی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے، تشدد کا خاتمہ اور امن کا آغاز اہل اسلام کے لیے فتحِ مبین (الفتح: 1) کی حیثیت رکھتا ہے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں کمیونکیشن کی ترقی اپنے آپ اسلامی دعوت کا ذریعہ بن گئی ہے۔ خلیجی جنگ (1991) کے دوران امریکا کے فوجی بڑی تعداد میں مصر اور عرب ملکوں میں گئے۔ ان کا انٹریکشن مسلمانوں سے ہو۔ اِس دوران تقریباً پانچ ہزار امریکی فوجیوں نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ واقعہ موجودہ زمانے میں ہر جگہ ہورہا ہے۔ فی الحال یہ واقعہ زیادہ تر اپنے آپ ہورہا ہے۔ اِس عمل میں ماڈرن کمیونکیشن عملاً دعوت کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔

گویا کہ ماڈرن کمیونکیشن کے زمانے میں دعوت کا کام خود تاریخی عمل (historical process) کا حصہ بن چکا ہے۔ اب مسلمانوں کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اِس تاریخی عمل میں اپنے آپ کو شامل کردیں۔ تاکہ جو کام اپنے آپ ہورہا ہے، وہ مزید شدت کے ساتھ براہِ راست کوشش کے ذریعے ہونے لگے۔ اور دعوت کا قافلہ بہت جلد اپنی مطلوب منزل تک پہنچ جائے۔ یہ مطلوب منزل، حدیث کے الفاظ میں یہ ہے کہ — اسلام کا کلمہ رُوئے زمین کے تمام چھوٹے اور بڑے گھروں میں داخل ہوجائے، کوئی بھی عورت یا مرد خدائی پیغام سے بے خبر نہ رہے (لا یبقیٰ علیٰ وجه الأرض بیت مدر ولا وبر، إلاّ أدخله الله کلمة الإسلام)۔

موت کا شعور

لوگ دیکھتے ہیں کہ ہر پیدا ہونے والا محدود مدت کے بعد مر جاتا ہے۔ اِس کے باوجود یہ نہایت عجیب بات ہے کہ کوئی شخص خود اپنی موت کے بارے میں نہیں سوچتا۔ وہ دوسروں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے، مگر خود اپنی موت کے بارے میں وہ غفلت میں پڑا رہتا ہے۔ موجودہ زمانے میں ڈی این اے (DNA) کی دریافت اِس سوال کا جواب ہے۔ یہ ایک نئی سائنس ہے۔ اِس پر دنیا کے بڑے بڑے دماغوں نے کام کیا ہے۔ اِس میں انڈیا کے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر ہرگوبند کھورانا (85 سال) کا نام بھی شامل ہے۔ اِس جدید تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر انسان کے جسم میں تقریباً ایک سوٹریلین سیل (living cells) ہوتے ہیں۔ ہر سیل کے نیوکلیس میں ایک ناقابلِ مشاہدہ ڈی این اے موجود رہتا ہے۔ ڈی این اے کے اندر انسانی شخصیت کے بارے میں تمام چھوٹی بڑی معلومات کوڈ کی صورت میں موجود رہتی ہیں۔ یہ معلومات اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ اگر اُن کو ڈی کوڈ (decode) کیا جائے، تو وہ برٹانکا جیسی ضخیم انسائکلو پیڈیا کے ایک ملین سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہوں گی:

One human DNA molecule contains enough information to fill a million-page encyclopaedia.

ڈی این اے کے اندر انسانی شخصیت کے بارے میں تمام معلومات درج ہوتی ہیں، مگر اِس فہرست میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ موت ہے۔ ڈی این اے کی طویل فہرست موت کے تصور سے خالی ہے۔ موت کا تصور انسانی شخصیت (human consciousness) میں موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی دوسروں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے، لیکن وہ خود اپنی موت کے بارے میں سوچ نہیں پاتا۔ یہی انسان کا امتحان ہے۔ موت کسی شخص کے اوپر ڈی این اے کی پروگریمنگ کے تحت نہیں آتی، بلکہ وہ براہِ راست خدائی فیصلے کے تحت آتی ہے۔ کامیاب انسان وہ ہے جو اپنے اندر اینٹی پروگریمنگ سوچ پیدا کرے۔ وہ خدائی فیصلے کی نسبت سے موت کے معاملے کو دریافت کرلے اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرے۔

اعلیٰ ذوق

دنیا میں سب سے زیادہ کمی کس چیز کی ہے۔ شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ دنیا میں سب سے زیادہ کمی اعلیٰ ذوق (high taste) کی ہے۔ اعلیٰ ذوق بلاشبہہ سب سے زیادہ کم یاب چیز ہے۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اعلیٰ ذوق کے لوگ ہی موجودہ دنیا میں اعلیٰ روحانی ترقی حاصل کرتے ہیں، اور اعلیٰ ذوق کے لوگ ہی آخرت میں جنت کے اعلیٰ درجات کو پائیں گے۔

لوگوں کے اندر اعلیٰ ذوق نہ ہونے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ گہری باتیں کہنے والے افراد لوگوں کے درمیان مقبول نہیں ہوتے، اِس طرح لوگ گہری دانش مندی کی باتوں سے بے خبر رہ جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ سطحی باتیں کرنے والے لوگ عوام کے درمیان مقبول ہوتے ہیں۔ اِس صورت حال کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ لوگ اعلیٰ انسانی ترقی سے محروم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر فخر پسندی ایک پست ذوق کی چیز ہے، اور تواضع پسندی اعلیٰ ذوق کی چیز۔ فخر (pride) کا تعلق جذبات سے ہے۔ اِس لیے ہر آدمی کے اندر، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، فخر کے جذبات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ اِس لیے جب کوئی شخص ایسی باتیں کرے جس سے لوگوں کو فخر کی غذا مل رہی ہو، تو وہ اس کی باتوں پر تالیاں بجاتے ہیں۔ ایسے انسان کے پاس بہت جلد لوگوں کی بھیڑ اکھٹا ہو جاتی ہے۔

اِس کے برعکس، تواضع (modesty) کا تعلق گہری دانش مندی سے ہے۔ صرف اعلیٰ ذوق کے لوگ ہی تواضع کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ چناں چہ جو شخص تواضع کی بولی بولے، اس کے گرد لوگوں کی بھیڑ اکھٹا نہیں ہوتی۔ ایسے انسان کی بات اعلیٰ ذوق کے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں اور وہی اُس کے گرد جمع ہو سکتے ہیں۔ اِس لیے تواضع کے بول بولنے والے انسان کے گرد وہ بھیڑ اکھٹا نہیں ہوتی، جو فخر کے بول بولنے والے انسانوں کے گرد اکھٹا ہو جاتی ہے۔

ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر اعلیٰ ذوق پیدا کرے۔ اعلیٰ ذوق اِس بات کا ضامن ہے کہ آدمی اعلیٰ روحانی حالت میں جیے گا، اور موت کے بعد جنت کے اعلیٰ درجات حاصل کرے گا۔

کامیاب زندگی کا راز

فطرت کے اصولوں کی پابندی کرنے کا نتیجہ ہمیشہ کامیابی ہوتا ہے،
اور فطرت کے اصولوں سے انحراف کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی۔

ڈِگری اور انگریزی

اگر آپ کی جیب میں بینک کا کریڈٹ کارڈ (credit card) ہے اور آپ شاپنگ سنٹر جائیں تو آپ کو اطمینان ہوتا ہے کہ آپ جو چیز بھی چاہیں گے، اس کو شاپنگ سنٹر سے خرید سکیں گے۔ آدمی کے پاس کریڈٹ کارڈ کا ہونا اِس بات کو ممکن بناتا ہے کہ وہ اپنی مطلوب چیز کو شاپنگ سنٹر سے بہ آسانی حاصل کرسکتا ہے۔ یہی معاملہ جاب مارکیٹ (job market) کا ہے۔ موجودہ زمانے میں ہر جگہ بہت بڑا جاب مارکیٹ موجود ہے۔ کوئی بھی آدمی جاب مارکیٹ میں داخل ہوکر اپنی مرضی کے مطابق جاب حاصل کرسکتا ہے، البتہ اُس کی ایک شرط ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ آدمی کے پاس دو چیزیں موجود ہوں— ڈگری اور انگریزی۔ موجودہ زمانے میں ڈگری اور انگریزی کی اہمیت گویا کہ کریڈٹ کارڈ کی مانند ہے۔ آپ اپنے آپ کو ڈگری اور انگریزی کے اعتبار سے تیار کر لیجیے، اِس کے بعد آپ کو جاب یا روزگار کے معاملے میں کوئی شکایت نہ ہوگی۔

معاش ہر آدمی کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ ہر آدمی کی یہ ضرورت ہے کہ اس کو کوئی قابلِ اعتماد معاشی ذریعہ حاصل ہو۔ قدیم زرعی دور میں معاشی ذریعہ زیادہ تر صرف ایک ہوتا تھا، اور وہ زرعی زمین (agricultural land) کا ذریعہ تھا۔ قدیم زمانے میں تمام لوگ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اِسی ذریعے سے اپنی معاش حاصل کرتے تھے۔

موجودہ زمانے میں صنعتی انقلاب (industrial revolution) نے حصولِ معاش کے ہزاروں نئے ذرائع پیدا کردیے ہیں۔ اِن نئے ذرائع کا براہِ راست تعلق تعلیم سے ہے، ایسی تعلیم جو آدمی کو ڈگری اور انگریزی دے سکے۔ موجودہ زمانے میں ہزاروں کی تعداد میں نئے قسم کے کام وجود میں آئے ہیں، مگر اِن تمام کاموں کا تعلق علم سے ہے۔ اِن حالات میں ڈگری اور انگریزی کی حیثیت گویا کہ شناختی کارڈ (indentity card) کی ہے۔ موجودہ زمانے میں ڈگری اور انگریزی، آدمی کی پہچان بناتی ہے۔ جس آدمی کے پاس یہ پہچان ہو، اُس کو موجودہ حالات میں اپنا معاشی مقام حاصل کرنے میں کوئی دقّت پیش نہیں آئے گی۔

حیوانِ کاسب نہ بنیے

موجودہ زمانہ انفجارِ مواقع (opportunity explosion) کا زمانہ ہے، یعنی مواقع کی فراوانی کا زمانہ۔ یہ مواقع مختلف قسم کے مقاصد کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں، لیکن عملی طور پر یہ ہوا ہے کہ 99 فی صد سے زیادہ لوگ ان مواقع کا صرف ایک ہی استعمال جانتے ہیں، اور وہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنا ہے۔ اِس صورتِ حال نے موجودہ زمانے میں تقریباً ہر انسان کو حیوانِ کاسب (earning animal) بنا دیا ہے۔

مگر یہ مواقع کا صرف کم تر استعمال (under-utilization) ہے۔ اِن مواقع کا زیادہ بڑا استعمال یہ ہے کہ اِس کو ذہنی ترقی (intellectual development) کے لیے استعمال کیا جائے۔ ذہنی ترقی کسی انسان کے لیے اوّلین حیثیت کی چیز ہے، اور دولت کمانا صرف ثانوی (secondary) حیثیت کی چیز۔ ذہنی ترقی کسی انسان کے لیے اعلیٰ ترین مقصد کی حیثیت رکھتی ہے، اور انسان کی زندگی اِس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اُس کو مقصدِ اعلیٰ سے کم تر کسی چیز میں استعمال کیا جائے۔

دولت بقدرِ ضرورت بلاشبہہ ایک اچھی چیز ہے، لیکن ضرورت سے زیادہ دولت ہمیشہ اور ہر انسان کے لیے وبالِ جان ثابت ہوتی ہے۔ کمانے والے کے لیے زیادہ دولت ذہنی تناؤ (tension) کا ذریعہ بنتی ہے، اور کمانے والے کی اولاد کے لیے وہ بے محنت کی کمائی (easy money) ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ بے محنت کی کمائی انسان کے لیے ہمیشہ تباہی کا ذریعہ بنتی ہے۔ اِس قسم کی دولت کمانے والا انسان آخر میں مایوسی (despair) کا شکار بنتا ہے، اور اس کی اولاد طرح طرح کے مسائل کا شکار۔

عقل مند انسان وہ ہے جو مال کو زندگی کی ضرورت بنائے، نہ کہ زندگی کا مقصد۔ جب آپ مال کو صرف ضرورت (need) کا درجہ دیں، تو اس سے آپ کی زندگی میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن جب آپ مال کو اپنی زندگی کا مقصد (goal) بنالیں تو اُس سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ یہ خرابیاں اتنی زیادہ اور اتنی سنگین ہوں گی کہ آپ اپنی ساری دولت کو خرچ کر کے بھی اِن خرابیوں کی اصلاح کرنے میں ناکام ثابت ہوں گے۔

عذر نہیں

انگریزی زبان کے ایک مشہور مقولے میں نہایت درست طور پر کہا گیا ہے کہ —— اگر تمھارے پاس ایک بہترین عذر ہو، تب بھی تم اس کو استعمال نہ کرو:

If you have a good excuse, don't use it.

عذر (excuse) انسانی زندگی میں ہر وقت پیش آتا رہتا ہے۔ کوئی بھی گھر یا کوئی بھی سماج عذر سے خالی نہیں۔ ایسی حالت میں اگر عذر کو عذر بنایا جائے تو آدمی کوئی کام نہیں کرسکتا۔ ہر وقت وہ کسی نہ کسی عذر میں پھنسا رہے گا، اور جو کرنے کا کام ہے، اس کو وہ نہ کر سکے گا۔

اِس مسئلے کا حل کیا ہے۔ اِس کا حل یہ ہے کہ دو قسم کے اَعذار (excuses) میں فرق کیا جائے۔ ایک، معمولی عذر (usual excuse) اور دوسرا، غیر معمولی عذر (unusual excuse)۔ معمولی عذر یہ ہے کہ گھر میں مہمان آجائیں، سر میں کچھ درد ہوجائے، کسی کو اسپتال میں دیکھنے کے لیے جانا ہو، خاندانی تقریب میں شرکت، کسی کی آمد پر اس کا استقبال (receive) کرنا اور اس کو بھیجنے (see off) کے لیے جانا، پیدائش اور موت کے واقعات، وغیرہ۔ یہ سب معمول کے عذر ہیں۔ ایسے عذر کو کسی ذمے داری کے سلسلے میں عذر بنانا درست نہیں۔

دوسرا عذر وہ ہے جو غیر معمولی عذر کی حیثیت رکھتا ہو، یعنی شدید قسم کا ناگہانی واقعہ۔ اِس دوسرے قسم کے عذر کو مجبور کُن عذر (compulsive excuse) کہا جاسکتا ہے۔ یہ وہ عذر ہے جو آدمی کے لیے سخت معذوری (crippling) کا سبب بن جاتا ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہے کہ اِس دنیا میں زندگی اعذار (excuses) سے بھری ہوئی ہے تو ہر با مقصد انسان کو یہ کرنا ہوگا کہ وہ عذر سے اوپر اٹھ جائے، تاکہ مقصدِ حیات کے اعتبار سے جو بڑا کام اس کو کرنا ہے، اُس بڑے کام کو وہ انجام دے سکے۔ جو آدمی ایسا نہ کرے، وہ عذر کے قبرستان میں دفن ہو کر رہ جائے گا اور کوئی بڑا کام انجام نہ دے سکے گا۔

سادگی کا اصول

سادگی صرف عدم تکلّف کا نام نہیں، سادگی زندگی کا ایک بنیادی اصول ہے۔ سادگی کا مطلب یہ ہے کہ مادّی معاملات کے بارے میں اپنے آپ کو حقیقی ضرورت (basic need) تک محدود رکھا جائے، اور اپنی ساری توانائی کو صرف مقصدِ اعلیٰ کے راستے پر خرچ کیا جائے۔ سادگی کا تعلق لائف مینج مینٹ (life management) سے ہے، نہ کہ معروف معنوں میں محض ایک شخص کے ذاتی ذوق سے۔

سادگی زندگی کی ایک علاحدہ صفت نہیں، سادگی کا تعلق انسان کی تمام دوسری سرگرمیوں سے ہے۔ اِسی لیے ایک مشہور مقولے میں درست طور پر کہا گیا ہے کہ — اگر تم اعلیٰ ترقی حاصل کرنا چاہتے ہو تو سادگی کا طریقہ اختیار کرو:

Simple living, high thinking

سادہ زندگی اور اونچی سوچ (high thinking) دونوں ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں۔ سادہ زندگی نہیں تو اونچی سوچ بھی نہیں۔ اونچی سوچ یا اعلیٰ ذہن کی تشکیل کے لیے اِرتکاز (concentration) نہایت ضروری ہے، اور سادگی کے بغیر ذہنی ارتکاز (intellectual concentration) پر قائم رہنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

جب کوئی شخص سماجی زندگی میں رہتا ہے تو اس کے ساتھ بار بار ڈسٹریکشن (distraction) کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، یعنی ایسی چیزوں میں مشغول ہونا جو آدمی کو اس کے حقیقی مقصد سے منحرف کردیں۔ ڈسٹریکشن کا معاملہ سماجی زندگی میں بار بار پیش آتا ہے۔ لیکن جس آدمی کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد ہو اور وہ واقعی معنوں میں اس کو حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ڈسٹریکشن سے بچائے۔ ڈسٹریکشن آدمی کی توجہ کو اس کے اصل مقصد سے ہٹاتا رہتا ہے۔ کوئی بامقصد انسان اِس قسم کے ڈسٹریکشن کو گوارا نہیں کرسکتا۔ سادگی بامقصد انسان کا کلچر ہے، بامقصد انسان اِس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ سادگی کے اصول کو ترک کردے۔

سوال وجواب

سوال

آج کل گراس روٹ (grassroots) کا بہت چرچا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ گراس روٹ سے کام کرنے کا طریقہ ٹھوس طریقہ ہے۔ یہی اصلاحی کام کا زیادہ صحیح طریقہ ہے۔ لیکن آپ کا طریقہ بظاہر اِس سے مختلف نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ گراس روٹ لیول (grassroot level) سے کام کرنے کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے۔ ایسا کیوں ہے، اور اِس معاملے کی حقیقت کیا ہے۔ (محمد ذکوان ندوی، نئی دہلی)

جواب

گراس روٹ لیول سے کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ عوام کی سطح سے کام کیا جائے، یعنی اصلاحی کام کا آغاز گاؤں سے کرنا، یا غریب بستیوں سے کرنا، یا بے پڑھے لکھے عوام سے کرنا۔ اِس طریق کار میں کچھ فائدے ضرور ہیں، لیکن یہ کام کا زیادہ نتیجہ خیز طریقہ نہیں۔ نچلی سطح کے لوگوں کو گراس روٹ سمجھنا، ایک غلط مفروضہ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ گراس روٹ انسان کا ذہن ہے، یعنی انسان کی سوچنے کی صلاحیت کا مرکز۔

مذکورہ مفروضے کے مطابق، بہت سے بڑے بڑے لوگوں نے گراس روٹ سے کام کیا ہے، مگر اُن کے اپنے نشانے کے مطابق، ان کے کام کا کوئی بڑا نتیجہ نہیں نکلا۔ مثال کے طور پر مدر ٹریسا (وفات: 1997) کا نام اِس معاملے میں بہت زیادہ مشہور ہے، لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ ان کی موت روحانی کرب (agony) کے عالم میں ہوئی۔ آخر وقت میں وہ اپنے کام سے غیر مطمئن تھیں۔ کیوں کہ جس نشانے کو سامنے رکھ کر انھوں نے کام شروع کیا تھا، وہ نشانہ ان کو حاصل نہیں ہوسکا۔ یہی حال اُن تمام بڑے بڑے مصلحین (reformers) کا ہے جنھوں نے اپنے خیال کے مطابق، مفروضہ گراس روٹ سے کام شروع کیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے تمام اعمال کا مصدر اور منبع اس کا ذہن (mind) ہے۔ آدمی جیسا اپنے ذہن سے سوچتا ہے، ویسا ہی وہ عمل کرتا ہے۔ اِس لیے آدمی کا ذہن (mind) انسانی زندگی میں گراس روٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی بات فطری نقشے کے مطابق ہے۔ ہم اپنا کام اِسی فطری نقشے کے بنیاد پر کررہے ہیں۔ ہم انسان کے ذہن کو تمام انسانی اعمال کے لیے گراس روٹ سمجھتے ہیں۔ اِس لیے ہماری تمام کوشش یہ ہے کہ انسان کا ذہن بدلے، انسان کی سوچ بدلے، انسان کے اندر صحیح طرزِ فکر پیدا ہو۔ سوچ بدلے گی تو زندگی بدلے گی، اور اگر سوچ نہ بدلے تو کچھ بھی بدلنے والا نہیں۔

سوال

عام طور پر یہ سمجھتا ہے کہ شادی یا نکاح کے معاملے میں اسلام کا طریقہ ارینجڈ میرج (arranged marriage) کا طریقہ ہے۔ مگر موجودہ زمانے میں اِس طریقے کو روایتی (traditional) طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ آج کل کے نوجوانوں کا یہ خیال ہے کہ شادی یا نکاح زندگی کا ایک بے حد اہم معاملہ ہے، اِس لیے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا یہ ماننا ہے کہ اُنھیں اس معاملے کا فیصلہ خود کرنا چاہیے۔ اِس دوسرے طریقے کو عام طور پر لَو میرج (love marriage) کہا جاتا ہے۔ اِس معاملے میں آپ کی رائے کیا ہے۔ براہِ کرم، اِس کی وضاحت فرمائیں (رابعہ، کرناٹک)۔

جواب

موجودہ دنیا عقل کا امتحان ہے۔ جو آدمی سوچ سمجھ کر کام کرے گا، وہ کامیاب ہوگا اور جو شخص محض جذبات کے تحت کام کرے گا، وہ ناکام ہوگا۔ جہاں تک شادی کا تعلق ہے، شادی لَو میرج کا نام نہیں۔ لو اَفیئر (love affair) یا لو میریج کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ صرف سطحی جذباتیت کا خوب صورت نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی یا نکاح اپنے لیے ایک لائف پارٹنر حاصل کرنے کا نام ہے۔ زوجین کو چاہیے کہ وہ نکاح کے معاملے کو اِسی نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ اِس معاملے میں وہ جذباتی مغلوبیت کے تحت کوئی کام نہ کریں، بلکہ خالص عقلی فیصلے کے تحت کام کریں۔

لَو افیئر یا لو میریج صرف وقتی جذباتیت کا نتیجہ ہوتی ہے، جب کہ نکاح کا تعلق عورت یا مرد کی

پوری زندگی سے ہوتا ہے۔ اِس معاملے میں دانش مندانہ فیصلہ ہمیشہ کے لیے آدمی کی زندگی کو خوش گوار بنا دیتا ہے۔ اِس کے برعکس، جذباتی فیصلہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کو تلخ بنا دیتا ہے۔ اِس دنیا میں عقلی فیصلے کا نتیجہ کامیابی ہے اور جذباتی بہاؤ کا نتیجہ ناکامی۔

سوال

ایک دینی حلقے سے جُڑے ہوئے لوگوں کے درمیان تدبر قرآن اور فہم قرآن کی باتیں ممنوع قرار دے دی گئی ہیں۔ ان کے نزدیک عوام کے لیے قرآن صرف تلاوت کی شے ہے، تدبر قرآن اور فہم قرآن صرف علماء کا حق ہے۔ اِن دنوں عوام کو قرآن فہمی سے روکنے کے لیے اِن حضرات کے ذریعے ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ — ''صحابہ کرامؓ نے فرمایا کہ ہم نے پہلے ایمان سیکھا، پھر قرآن سیکھا (تعلّمنا الإیمان، ثمّ تعلّمنا القرآن)''۔ پھر اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ ایمان کو پختہ کئے بغیر قرآن فہمی کی کوشش گم راہی کا سبب بن سکتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ خود قرآن میں تدبّر کرنے کا حکم دیتا ہے تو اِس قسم کی حدیثوں کی حقیقت کیا ہے۔ آخر یہ حضرات عوام کو قرآن سے دور کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ مہربانی فرما کر اس مسئلے میں ہم لوگوں کی رہ نمائی کریں، شکریہ (محمد خورشید اکرم سوز، کیلاش نگر، مہاراشٹر)۔

جواب

آپ نے جس حدیث کا ذکر کیا ہے، وہ صحیح اسناد سے ثابت ہے۔ لیکن صحابی کے اِس قول کی وہ تشریح درست نہیں جس کو آپ نے کچھ لوگوں کی طرف منسوب کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ صحابی کے اِس قول میں ایمان سے مراد معرفت ہے، اور قرآن سے مراد شریعت۔ یہ بالکل درست ہے کہ اسلام میں پہلا دعوتی عمل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر معرفت پیدا کی جائے، یعنی لوگوں کی سوچ کو بدلا جائے، لوگوں کو ذہنی اعتبار سے تیار کیا جائے۔ اِس ذہنی تیاری کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ لوگ اسلام کے عملی احکام کو اپنی زندگی میں اختیار کریں۔

تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ معرفت کے حصول کا ذریعہ بھی قرآن ہی ہے۔ کوئی اور خودساختہ

طریقہ نہیں۔قرآن ہی کی رہ نمائی میں یہ کیا جائے گا کہ لوگوں کو بدلا جائے۔لوگوں کے اندر معرفت پیدا کی جائے جس کو ایمان کہا گیا ہے۔قرآن سے باہر معرفت کے حصول کا کوئی اور طریقہ وضع کرنا ایک بدعت ہے،اور بدعت سے کبھی کوئی بہتر نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

’تذکیر القرآن‘ اِسی اصول پر لکھی گئی ہے۔تذکیر القرآن میں قرآن کے اُن پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے جو معرفت یا شعورِ ایمان کو پیدا کرنے والے ہیں۔تذکیر القرآن کے جس صفحے کو بھی آپ کھولیں،آپ یہ حکمت اس کے اندر پائیں گے۔ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ تذکیر القرآن کے ذریعے لوگوں کے اندر شعورِ ایمان پیدا کیا جائے۔شعور ایمان کا پیدا ہونا گویا کہ استعداد کا پیدا ہونا ہے۔اور جب استعداد پیدا ہوجائے تو اس کے بعد خود ہی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ شریعت کے عملی احکام کو اپنی زندگی میں اختیار کر لیتے ہیں۔

سوال

اسلامی شریعت کے مطابق، یہ مسئلہ بتایا جاتا ہے کہ قیامت کے دن خدا ظاہر ہوگا۔ وہ اچھے لوگوں کو جنت میں جگہ دے گا اور برے لوگوں کو جہنم میں داخل کرے گا۔ بہت سے لوگ اِس پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا تو ارحم الراحمین ہے، پھر خدا رحمت والا خدا ہونے کے باوجود کیوں لوگوں کو ابدی جہنم میں داخل کرے گا (رجت ملہوترا، نئی دہلی)۔

جواب

قیامت کے جزا اور سزا کا تعلق رحمت سے نہیں ہے، بلکہ عدل سے ہے۔ یہ خدا کے عدل کا تقاضا ہے کہ وہ لوگوں کو اُن کے عمل کے مطابق، جزا یا سزا دے۔

قیامت میں جن لوگوں کے لیے جہنم کا فیصلہ کیا جائے گا، وہ ان کے اندھے پن کی بنا پر ہوگا۔ کیوں کہ انھوں نے نعمتوں کا بھرپور استعمال کیا،لیکن انھوں نے منعم کا اعتراف نہیں کیا۔

خدا نے ان کو اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا،لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ پیدا کرنے والا کون ہے۔ خدا نے اُن کو سیارۂ ارض (planet earth) جیسی جگہ رہنے کے لیے دی، لیکن

انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ استثنائی زمین کس نے بنائی۔ خدا نے سورج کے ذریعے روشنی اور حرارت کا انوکھا انتظام کیا، لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ انوکھا انتظام کرنے والا کون ہے۔ خدا نے اُن کے لیے آکسیجن کی مسلسل فراہمی کا انتظام کیا، لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ فراہمی کس کی طرف سے ہو رہی ہے۔ خدا نے زمین سے اُن کے لیے طرح طرح کی غذائیں نکالیں، لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کون ہے جو یہ سب کر رہا ہے۔ خدا نے دریاؤں اور سمندروں کو پانی سے بھر دیا، لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اِس زندگی بخش نعمت کو فراہم کرنے والا کون ہے۔ خدا نے دنیا میں انسان کے لیے وہ تمام چیزیں فراہم کیں، جن کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے، لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اِس لائف سپورٹ سسٹم کو دینے والا کون ہے۔

وہ لوگ جو نعمتوں کو استعمال کریں، لیکن وہ منعم کا اعتراف نہ کریں، ایسے لوگوں کو قرآن میں اندھا اور بہرا (الإسراء: 72) بتایا گیا ہے۔ جہنم دراصل انھیں اندھے اور بہرے لوگوں کے لیے ہے۔ جو لوگ دنیا کی زندگی میں اندھے اور بہرے بن کر رہیں، جن کا حال یہ ہو کہ وہ نہ اپنی عقل سے سوچیں، اور نہ اپنی آنکھ سے دیکھیں، اور نہ اپنے کان سے سُنیں، ایسے لوگوں کا انجام بلاشبہہ یہی ہوسکتا ہے کہ ان کو مابعد موت دورِ حیات (post-death period) کے ابدی مرحلے میں خدا کی اِن رحمتوں سے محروم کر دیا جائے۔ وہ دوبارہ خدا کی رحمتوں میں حصے دار نہ بن سکیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو قرآن میں اہلِ جہنّم (الأعراف: 179) کہا گیا ہے۔

سوال

May name is Yusuf Vorajee, I am 35 years old. I am a born and bred south African. I hail from a town called Lenasia, a suburb of Johannesburg. I have had the privilege of a good Islamic upbringing. When I was 21 years of age I decided to pursue the study of Islam seriously. The only option available to me at the time was to go to a local dar al-ulum affiliated to the madrasah in Deoband. I studied in this institution for 7 years, but was always at loggerheads with the authorities regarding issues of teaching methodology, curriculum content, interpretation of sources etc.

After I qualified, however, then I came into real conflict with the

'ulama fraternity after I refused to submit to the dictates of the 'ulama uncritically. I have subsequently been ostracized by the 'ulama, rendered unemployable and labeled a deviant.

During this time (over 7 years plus the period of my studies), one of the sources by which I drew solace was your writings. Whenever I was asked to speak in a Musjid I spoke from your books.

At present I find myself in a “spiritual mess”. I have literally been ostracized by the “ruling” ‘ulama body here who exert every influence over most of the Islamic organizations. I have continuosly been refused work at “their” madaaris and Islamic schools and anywhere else. I am not called upon to deliver khutbas, jumu'ah or otherwise any longer, I have no avenues from which to articulate my thought. Friends I had from my madrasah days avoid me. I read extensively and continue studying on my own, and have grown beyond the narrow outlook of the traditional ulema fraternity. It’s not possible for me to move away to a different place or locality as I have a widowed mum and an ailing widowed grandmother to take care of, and I am an only child. I am also married and have two beautiful children alhamdulillah. Because of this total isolation and ostracism, I feel abandoned by Allah (SWT) and there are days when I question my faith, times when I felt shaken to my core. When I contemplate my predicament, I am able to understand and accept it on an intellectual level, and have intellectual responses; but I can’t come to terms with it emotionally or spiritually, and I am in serious need of a spiritual guide and mentor.

I do realize that you are extremely busy but if you could spare a few minutes for me so that I may solicit advice from you albeit electronically I would be most grateful. Also I humbly request you to make du'a for me. (Yusuf Vorajee, South Africa)

جواب

According to my experience, I would make some suggestion to you:

1. First of all, you will have to study all of my books, also you will have to be a regular reader of my monthly magazine “Al-Risala”, published from Islamic Centre, New Delhi, India. This magazine and other of my writings are also available on the internet (www.alrisala.org).

2. According to my analysis, all of your problems are the result of one thing alone. And that is your idealism. You are an idealist, and idealists always try to translate their ideals into their social matters, but it

1- پاکستان کے جیو (Geo TV) نے 25 اکتوبر 2007 کو اپنے اسٹوڈیو میں ایک پینل ڈسکشن رکھا۔ یہ ڈسکشن انگریزی میں تھا۔ اِس کا موضوع تھا— اسلامی شناخت (Islamic identity)۔ اِس ڈسکشن میں پاکستان کے تین پروفیسر شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز کو بھی اِس میں اِس طرح شریک کیا گیا کہ انھوں نے دہلی سے ٹیلی فون پر اپنا نقطۂ نظر بتایا اور اس کو 'جیو ٹی وی' کے پروگرام میں نشر کیا گیا۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلامی شناخت کا تعلق کلچر سے نہیں ہے، بلکہ کردار سے ہے۔ مسلمان کی پہچان اس کا اسلامی کردار ہے۔ حدیث (**خالفوا الیهود والنّصاریٰ**) کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ اِس سے مراد دوسری قوموں کا کلچر نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد دوسری قوموں کی مذہبی علامت (religous symbol) ہے۔ جیسے کہ مسیحی لوگوں کا اپنی گردن میں صلیب لٹکانا، وغیرہ۔

2- دوردرشن (نئی دہلی) نے 12 نومبر 2007 کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو لیا۔ اِس کا موضوع— اسلام میں لڑکیوں کی تعلیم تھا۔ یہ انٹرویو 12 نومبر کی شام کو لائیو ٹیلی کاسٹ کے تحت نشر کیا گیا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام میں تعلیم کی اہمیت جس طرح مردوں کے لیے ہے، اُسی طرح عورتوں کے لیے ہے۔ چناں چہ آج سارے ملک میں مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ہزاروں ادارے کھلے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کے بغیر عورت اپنا رول صحیح طور پر ادا نہیں کرسکتی۔

3- 13 نومبر 2007 کو ای ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے صدر اسلامی مرکز کا ایک ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ انٹرویو حج کے موضوع پر تھا۔ اِس انٹرویو کو 16 نومبر کی شام کو ساڑھے نو بجے نشر کیا گیا۔ حج کے بارے میں بتایا گیا کہ حج، اسلام کی ایک بہت بڑی عبادت ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کے مشن اور پیغمبر اسلام کے مشن کے اتباع کا ایک عہد ہے۔ حج، امن اور اتحاد اور عالمی انسانیت کا پیغام ہے۔

4- سائی انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں 14 نومبر 2007 کو ایک پروگرام ہوا۔ اِس میں مختلف اسکولوں کے پرنسپل حضرات شریک ہوئے۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام اور بنیادی انسانی اَقدار کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ چوں کہ آنے والا حج (21 دسمبر 2007) کا زمانہ قریب تھا۔ اِس لیے اِس تقریر میں حج کو لے کر مذکورہ موضوع کی وضاحت کی گئی۔ تقریر کے آخر میں سوال و جواب کا پروگرام ہوا۔ اِس موقع پر انگریزی میں چھپا ہوا اسلامی لٹریچر بھی لوگوں کے درمیان تقسیم کیا گیا۔ مثلاً (Reality of Life) کے نام سے چھپا ہوا پمفلٹ۔ اِس کے علاوہ لوگوں کو ویب سائٹ کے بارے میں بتایا گیا۔ لوگوں نے کہا کہ وہ اِس سے استفادہ کریں گے۔

5- 25 نومبر 2007 کو نئی دہلی میں انڈیا اور پاکستان کا کرکٹ میچ تھا۔ اِس موقع پر سی پی ایس انٹرنیشنل کے ایک ممبر نے دونوں طرف کے کھلاڑیوں کو صدر اسلامی مرکز کے لکھے ہوئے اردو اور انگریزی لٹریچر دستی طور پر پہنچائے۔ کھلاڑیوں نے اس کو بہت شوق سے لیا اور اُس سے اپنی دل چسپی کا اظہار کیا۔

6- سائی انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں 5 دسمبر 2007 کو ایک پروگرام ہوا۔ اِس میں سنٹرل اسکولوں کے

پرنسپل حضرات شریک تھے۔اس کی دعوت پرصدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام میں بنیادی انسانی اقدار کے موضوع پر ایک تقریر کی۔آخر میں سوالات کا جواب دیا۔اِس موقع پر لوگوں کے درمیان انگریزی زبان میں اسلامی لٹریچر بھی تقسیم کیا گیا۔لوگوں نے اس کو نہایت شوق سے لیا اور اپنی دل چسپی کا مظاہرہ کیا۔

7- پٹنہ بُک فیر (Book Fair) کا شمار ہندستان کے بڑے بک فیر میں ہوتا ہے۔ ہر سال کی طرح اِس سال بھی پٹنہ کے تاریخی گراونڈ 'گاندھی میدان' میں 7 تا 18 دسمبر 2007 یہ بُک فیر منعقد کیا گیا۔گڈورڈ بُکس (نئی دہلی) کا اسٹال بھی یہاں لگایا گیا۔اِس کا انتظام شاہ عمران حسن نے سنبھالا۔صدر اسلامی مرکز کا ہندی ترجمۂ قرآن (پوتر قرآن) تیسرے دن ہی ختم ہوگیا۔ان کی دیگر کتابوں کو بھی لوگوں نے بہت شوق سے لیا۔الرسالہ مشن سے وابستہ مقامی افراد مثلاً ابوالحکم محمد دانیال، حافظ عبدالرافع، وغیرہ نے بک اسٹال کو کامیاب بنانے میں اہم رول ادا کیا۔بُک اسٹال پر صوبہ بہار کے معروف اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات تشریف لائے، جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل تھے۔مثلاً ڈی ایس پی توحید پرویز، پنڈت رام کرشن سوامی، وغیرہ۔اس کے علاوہ امارتِ شرعیہ کے طلباء اور اساتذہ نے اسٹال پر تشریف لاکر اپنی خوشی کا اظہار فرمایا، اور وہاں سے بڑی تعداد میں صدر اسلامی مرکز کی کتابیں اور ماہ نامہ الرسالہ حاصل کیا۔پٹنہ کے مشہور روزنامہ ''قومی تنظیم'' نے اپنے شمارہ 13 دسمبر 2007 میں حسب ذیل الفاظ میں اس کی رپورٹ شائع کی ہے:

کتاب میلہ (بک فیر) میں پوتر قرآن اور گاڈ ارائز خصوصی توجہ کا مرکز

''اس کتاب میلہ کی جو سب سے قابل ذکر اور قابل غور بات ہے وہ یہ ہے کہ ''پوتر قرآن'' اور گاڈ ارائزز'' (God Arises) نام کی کتاب لوگ خوب خرید رہے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں دہلی کے ایک مشہور پبلشر گڈ ورڈ (Goodword) نے شائع کی ہیں۔دونوں کتابیں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم حضرات بھی شوق سے خرید رہے ہیں۔''پوتر قرآن'' قرآن کا سادہ اور سلیس زبان میں ترجمہ ہے جس کا ہدیہ دعوت کے مقصد سے صرف 25 روپیے رکھا گیا ہے اور'' گاڈ ارائزز'' عالم اسلام کے مشہور عالمِ دین اور مفکر مولانا وحیدالدین خاں کی کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' کا انگریزی ترجمہ ہے۔اس میں سائنٹفک دلائل کی روشنی میں اسلامی عقائد اور اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کیا گیا ہے۔ یہاں ہم پھر سے یہ واضح کردیتے ہیں کہ ''پوتر قرآن'' کو سب سے زیادہ غیر مسلم حضرات خرید رہے ہیں۔ساتھ ہی وہ خریدتے وقت اسلام کے بارے میں معلومات بھی حاصل کررہے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کتاب میلہ دعوت الی اللہ کا مرکز ہو۔اس سے مسلمانوں کو سبق لینا چاہیے جو قرآن نہیں پڑھتے اور ان کو اس میلے سے فیض یاب ہونا چاہیے'' (صفحہ 9)۔

8- مختلف لوگوں تک ماہ نامہ الرسالہ پہنچانے کے لیے بہت سے حضرات اپنی طرف سے اس کا مخلصانہ تعاون پیش کرتے ہیں۔ اِس سال (2008) سی پی ایس انٹرنیشنل کی ٹیم کے ایک ممبر نے انڈیا کے ایک سو سے زائد دینی مدارس کے نام ماہ نامہ الرسالہ بھجوانے کے لیے اس کا سالانہ زرِتعاون دیا ہے۔ان مدارس کے نام ایک سال کے لیے الرسالہ جاری کردیا گیا ہے۔الرسالہ کے دعوتی مشن کو پھیلانے کا یہ بلاشبہہ ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

9- الرسالہ کا دعوتی لٹریچر خدا کے فضل سے مسلسل طور پر پھیل رہا ہے۔ سی پی ایس کی ٹیم کے ایک ممبر نے کچھ تعلیم یافتہ حضرات کے سامنے ’تذکیر القرآن‘ کا ایک نسخہ پیش کیا۔ انھوں نے اس پر ایک منفی ریمارک دیا۔ سی پی ایس کے مذکورہ ممبر نے ان سے کہا کہ آپ تذکیر القرآن کا ایک صفحہ پڑھیں۔ اس کے بعد کوئی ریمارک دیں۔ اِس کے بعد اُن حضرات نے تذکیر القرآن میں سورہ فاتحہ کی تشریح پڑھی، اور فوراً اس کی تین کاپیوں کے لیے نقد آرڈر روانہ کر دیا۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی تحریک اگر اپنے آپ میں سچائی پر کھڑی ہو، تو سچائی کی یہ طاقت ہی زندہ اور سنجیدہ انسانوں کے لیے اس کی طرف سے اس کے کامل دفاع کے لیے کافی ہو جائے گی۔

10- صدر اسلامی مرکز کی اردو تفسیر تذکیر القرآن کا ہندی ایڈیشن چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ خواہش مند حضرات اس کو گڈ ورڈ بکس (نئی دہلی) سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس تفسیر کا ہدیہ مبلغ -/200 روپئے ہے۔

11- Tuesday, 18 December 2007

I am delighted to read Al Risala, November 2007, which is exclusively about Asmaa' Husna and Ism A'zam. Many Thanks for considering the request of Kalim, and sharing your valuable thoughts on this important subject. The articles are well written and dispel many doubts in the minds of people. Also, they are very inspiring as you have laced the descriptions with real examples from Islamic history and your personal life. There is no doubt that your writings do convince a modern educated man and are in the style and idiom which he understands and appreciates. I pray for your long life and good health so that you may continue rendering this great service.

Al Risala, November 2007, has been an eye opener for me, particularly. Now I very clearly understand what is a super du'aa' and what is invocation, as different from what we normally pray in which there is not much earnestness.The caption on the title page of Al Risala always fascinates me a great deal. However, the one on al Risala of November 07 is highly inspiring and is a statement of universal truth. Also, the way it gets linked up with the anecdote of Sultan 'Abdur Rahman An-Nasir (d. 961 CE) is revealing. The story of Sir Syed Ahmad Khan (d. 1989) at the end of Al Risala (pp. 44-45) is very inspiring and educative.

It will be worthwhile to have this issue of Al Risala translated into English for wider circulation and the same could also be posted on the Internet. Such a useful writing must reach to as many people as possible. I hope someone will take up this job. (Shakil Ahmad Khan, Sharjah, UAE)

اسکیم برائے ادارہ ومساجد

مساجد اور مدارس اور اداروں کے لیے مولانا وحید الدین خاں کی دس کتابوں کا ایک منتخب سیٹ تیار کیا گیا ہے۔ خواہش مند حضرات آرڈر روانہ کرکے کی خصوصی رعایتی قیمت پر اس کو حاصل کرسکتے ہیں۔ ڈاک خرچ ادارے کے ذمہ ہوگا۔ نیز یہ آرڈر صرف .D.D یا .M. O کے ذریعے روانہ کیا جائے گا۔ جو حضرات کتابوں کا یہ منتخب سیٹ مساجد اور مدارس اور اداروں کو اپنی طرف سے ہدیہ کرنا چاہتے ہوں، وہ بھی اِس اسکیم میں حصہ لے سکتے ہیں۔ کالج اور یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ بھی اس اسکیم سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

سیٹ برائے مساجد		سیٹ برائے ادارہ ومدارس	
تذکیر القرآن (اُردو)	تذکیر القرآن (ہندی)	تذکیر القرآن (اُردو)	اللہ اکبر
اللہ اکبر	قال اللہ وقال الرسول	مطالعۂ سیرت	الاسلام
مطالعہ حدیث	دعوتِ حق	فکر اسلامی	دین وشریعت
سیرتِ رسول	اسلامی زندگی	تجدیدِ دین	مذہب اور جدید چیلنج
دعوتِ اسلام	رازِ حیات	انسان کی منزل	رازِ حیات
رعایتی قیمت صرف: -/Rs. 500		رعایتی قیمت صرف: -/Rs. 500	

خصوصی اسکیم

طلبہ اور اساتذہ کے لیے ماہ نامہ الرسالہ کا سالانہ زرِتعاون مبلغ 50 روپیے کردیا گیا ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ بھی اس اسکیم سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 24355454, 24355729, email: skhan@vsnl.com